وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے

از

ڈاکٹر سید عبداللطیف

اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز
حیدرآباد دکن

وہ ذہن جسکی تعمیر قرآن کرتا ہے

مُصَنّفہ

ڈاکٹر سید عبداللطیف پی ایچ، ڈی (لندن)
سابق پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

مُترجمہ

عبدالقیوم خاں باقی ایم اے
ریڈر شعبۂ اردو و فارسی نظام کالج، حیدرآباد دکن

اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز
حیدرآباد دکن

فہرستِ ابواب

صفحہ

سخن ہائے گفتنی

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی گراں قدر انگریزی تصنیف "The Mind Al-Quran Builds" جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اسلامی ادبیات عالیہ میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے، تقریباً تین سال قبل حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ انگریزی داں طبقوں میں اس کتاب کا نہایت ہی پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ مضمون کے اعتبار سے یہ کتاب دورِ حاضر میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی اور سب سے عمدہ کتاب قرار دی گئی۔ اردو داں طبقہ اس کا متمنی تھا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی جلد از جلد شائع کروا دیا جائے تاکہ انہیں بھی اس سے استفادہ کا موقع مل سکے۔ ابتداءً چند کہنہ مشق مترجمین نے اس کتاب کے ترجمہ کی کوشش بھی کی لیکن ڈاکٹر صاحب کی قادر الکلامی اور ان کے مخصوص اسلوب بیان کے سامنے انہیں اپنی ہار ماننی پڑی اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کا انداز تحریر سادہ اور واضح ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا چست، جامع اور بلیغ ہوتا ہے کہ اس کو کسی دوسری زبان میں اسی انداز و روانی کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمہ کرنے کے لئے بڑی دماغ سوزی اور جگرکاوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ میں ڈاکٹر صاحب کی اس انگریزی تصنیف کے دوران میں ان کے ساتھ اور ان کی تحقیقات میں شریک رہا ہوں اور

اس سلسلہ میں مجھے تھوڑی بہت حقیر خدمات بھی انجام دینے کا موقع ملا ہے اس لئے طبعاً ڈاکٹر صاحب کا یہ رجحان تھا کہ میں ہی اس کتاب کا اُردو ترجمہ کروں تاکہ اُردو زبان میں ان کے افکار و خیالات کی صحیح صحیح ترجمانی ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ ناچیز کی حقیر خدمات کا جس شفقت آمیز انداز میں اپنے دیباچہ میں تذکرہ فرما کر مجھے جو اعزاز بخشا ہے اس کے لئے میں اپنے محترم استاد کا بیحد ممنون و شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس رجحان کو محسوس کرتے ہوئے میں نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے، اس کتاب کے اردو ترجمہ کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں جس پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی مسرت اور اطمینان کا اظہار فرمایا۔ کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا گیا اور اکثروں کو یہ معلوم بھی ہو گیا تھا کہ میں اس کام میں مصروف ہوں لیکن کسے کیا خبر تھی کہ اس کتاب کے ترجمہ کا شرف درحقیقت کسی اور کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے۔ مصروفیات کی وجہ ترجمہ کی رفتار کسی قدر سست تھی۔ دیباچہ اور پہلے باب کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ دوسرے باب کا آغاز تھا کہ ایک واقعہ رونما ہوتا ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست عبدالقیوم خاں باقی جو نظام کالج کے شعبہ اُردو و فارسی میں ریڈری کی خدمت پر فائز تھے، ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے میں اور کاغذات کا ایک پلندہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں تحفتہً پیش فرماتے ہیں۔ یہ پلندہ دراصل ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے پہلے سات ابواب کا اُردو ترجمہ تھا جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے علم و اطلاع کے بغیر کیا تھا مرحوم کے بیان کے مطابق گیا

وہ ذہن جسکی تعمیر قرآن کرتا۔

یہ وہ ابتدائی مسودہ تھا جو انہوں نے بدورانِ گرمائی تعطیلات اورنگ آباد میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہ کے ایک پرسکون گوشہ میں بیٹھ کر مکمل کیا تھا اور یہ ترجمہ درحقیقت ان کی اس اندرونی خواہش کی تکمیل تھی جو ان میں ڈاکٹر صاحب کی انگریزی تصنیف کے مطالعہ کے بعد پیدا ہوئی تھی۔
اس اچانک واقعہ نے ڈاکٹر صاحب کے موقف کو نہایت پیچیدہ کر دیا مجھے بھی اس کی اطلاع کروائی گئی۔ گو مجھے اس واقعہ سے تکلیف ضرور ہوئی لیکن یہ دیکھ کر کہ ڈاکٹر صاحب کے ایک قدیم شاگرد ہی نے اس ترجمہ کو تقریباً مکمل حالت میں پیش کیا ہے، میں نے ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی کہ باقیؔ مرحوم کی اس پیشکش کو قبول فرما لیا جائے لیکن میری یہ خواہش ہے کہ میرا کیا ہوا ترجمہ ضرور شریک کتاب رہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ دیباچہ اور پہلے باب کا میرا ترجمہ بجنسہٖ شریکِ کتاب کر لیا جائے اور دوسرے باب سے آخر تک باقیؔ مرحوم کا ترجمہ رہے چونکہ باقیؔ مرحوم کے ترجمہ میں بعض مقامات تشنہ رہ گئے تھے اس لئے یہ بھی طے پایا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں اپنے مسودہ کی اصل متن کیساتھ مقابلہ کرتے ہوئے نظر ثانی کرینگے تاکہ مسودہ میں کوئی خامی رہنے نہ پائے۔
لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مشیت کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ اس تصفیہ کے چند ہی ہفتوں بعد یکایک موت کے زبردست چنگل نے باقیؔ مرحوم کو ہم سے چھین لیا۔ اس ناگہانی حادثہ کا ڈاکٹر صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ باقیؔ مرحوم کا یہ مسودہ ایک مدت تک ایسا ہی دھرا رہا اس لئے کہ جب کبھی آپ اسکی نظر ثانی کا

خیال فرماتے شاگرد مرحوم کی یاد آپ کیلئے بیچینی اور تکلیف کا باعث ہوجاتی۔ غرض کچھ دنوں بعد اس مسودہ کی تکمیل کرلی گئی اور مبیضہ نظرثانی کے بعد بغرض طباعت پریس کے حوالے کردیا گیا۔ اب اسی اُردو ترجمہ کو بعنوان "وہ ذہن جسکی تعمیر قرآن کرتا ہے" زیور طبع سے آراستہ کرکے ہدیہ ناظرین کیا جارہا ہے تاکہ اُردو داں طبقہ اس سے کماحقہٗ استفادہ کرسکے۔ افسوس کہ باقی مرحوم اس وقت ہم میں موجود نہیں۔ اگر وہ ہوتے تو وہ خود اس کتاب کا پیش لفظ لکھتے لیکن چونکہ وہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں اس لئے مجبوراً مجھے ان کا یہ فرض ادا کرنا پڑرہا ہے۔

میں اپنے ان چند تمہیدی سطور کو بجائے "پیش لفظ" کے "سخن ہائے گفتنی" معنون کررہا ہوں اس لئے کہ مجھے تو یہاں درحقیقت "منظور ہے گزارش احوال واقعی"۔ رہا پیش لفظ تو سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر لطیف جیسے صاحب فکر اور صاحب قلم کی کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا نہ تو میرے بس کی بات ہے اور نہ بساط کی۔ لیکن جب مجھے سخن ہائے گفتنی سے سابقہ پڑ ہی چکا ہے تو میں یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس موقع پر اس کتاب اور اس کے قابل مصنف کے متعلق ان حقائق کو بھی آشکار کردوں جو اس گراں قدر تصنیف کا تخلیقی پس منظر رہے ہیں۔

ڈاکٹر لطیف کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ علم و ادب اور سیاست کے میدانوں میں

آپ نے اپنی تصانیف اور تحریرات کے ذریعہ اپنی سنجیدہ فکر رسا اور اپنی ماہرانہ قابلیت کا سکہ بٹھایا اور اپنے زور قلم کا لوہا منوایا ہے۔ دنیا نے آپ کو ایک بہترین ادیب، ایک پختہ کار سیاس اور ایک اعلیٰ مفکر کی حیثیت ہی سے جانا لیکن بہت سارے ابھی اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک اور شخصیت بھی ہے جس کا تعلق ان فقرائے عالیہ کے سلسلہ سے ہے جن کا منصب رشد و ہدایت اور مذہبی پیشوائی رہا ہے۔ میں یہاں ڈاکٹر صاحب کی اسی شخصیت کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ جوہر جو بطور ورثہ آپ میں ودیعت کیا گیا تھا وہ اب کس طرح تاباں و درخشاں ہو کر اپنی ضیاء پاشی کرنے لگا ہے۔ بلحاظ حسب و نسب ڈاکٹر صاحب حسنی اور حسینی سادات سے ہیں۔ ددیال کی جانب سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح سے اور ننیال کی جانب سے راست حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے ملتا ہے۔ اس سلسلہ کے بزرگوار حضرات نے دین اور مذہب کی جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ان بزرگوں کے علمی کارنامے آج تک سرچشمۂ علم و نور بنے ہوئے ہیں اور ان کے روحانی فیض سے ایک دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ آپ کے جداعلیٰ حضرت شاہ عبداللطیف رح المعروف بہ یاہو بادشاہ ایک باکمال بزرگ گزرے ہیں جن کے روحانی فیض کا سلسلہ آج تک کرنول میں جہاں آپ آرام فرما ہیں، جاری و ساری ہے۔ ڈاکٹر صاحب انہی فقرائے عالیہ کے سلسلہ سے تعلق اور

یا ہو بادشاہ رحمہ کے سجادہ اور گدی نشین ہیں۔ اس نسبی تعلق اور اسلاف کے علمی کارناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اسی گھر کا چشم و چراغ اسلام و مذہب کی خدمت سے مستثنیٰ رہے۔ مشیت کا یہ منشاء تھا کہ آپ اسلام کی ایک اہم خدمت انجام دیں اور اپنے پیچھے ایک ایسی یادگار چھوڑ جائیں جو بنی نوع انسان کی راہِ راست کی طرف رہبری کرتی رہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی مذہب سے بیگانہ اور ناآشنا نہیں رہے ہیں۔ جیسے جیسے آپ کے علمی تجربہ میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے ہی آپ کے اسلامی شغف میں زیادتی ہوتی گئی۔ اسلامی ثقافت اور اسلامی معاشرہ پر اعتراض کرنے والوں کو آپ نے اپنی بے باک و بہذ ور تحریرات سے ایسا مدلل و مسکت جواب دیا کہ پھر اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکی۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں آپ کے قلم کو کھری کھری سنانے میں کبھی لغزش نہیں ہوئی اور ببانگ دھل آپ نے اپنی سنجیدہ آراء کا اظہار فرمایا۔ آپ کے اس اسلامی شغف میں اندرونی طور پر بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عہدِ حاضر کے انقلابات، مسلمانوں کی زبوں حالی اور حقیقتِ مذہب سے بیگانگی، ملتِ اسلامیہ کا انتشار، اسلام اور بانیٔ اسلام پر معترضین کے رکیک حملوں اور اغیار کی مسلمانوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوششوں نے آپ پر تازیانہ کا کام کیا۔ خفتہ جذبات بیدار ہونے لگے۔ اسلام اور بانیٔ اسلام سے آپ کو جو والہانہ محبت تھی وہ آشکار ہونے لگی۔ وہ آگ جو ایک عرصہ سے دبی ہوئی تھی آہستہ آہستہ سلگنے لگتی ہے۔ دفعتاً اس میں

چنگاریاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور بالآخر یہ چنگاریاں ایک شعلہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک نیا ڈاکٹر لطیف جنم لینے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب قرآن و حدیث اور اسلامیات کا بنظر غائر مطالعہ فرمانے لگتے ہیں۔ بیجا نہ ہوگا اگر میں یہاں اپنے مشاہدات کو مختصراً یوں بیان کر دوں کہ اس دوران میں بسا اوقات میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک عجیب استغراقی کیفیت میں دیکھا اور بحالتِ رقت میں نے آپ کو بارہا ھو اور یاھو کے نعرے لگاتا ہوا پایا۔ آگ اپنا کام کر چکی تھی، مشیت کا منشا پورا ہو چکا تھا۔ آپ کی فکر رسا کام کرنے لگتی ہے اور اپنے لئے ایک نرالے موضوع کا انتخاب کرتی ہے۔ قلم کو جنبش ہوتی ہے اور آپ کا سوزِ دروں اپنے مخصوص انداز میں اسلام کی حقیقی روح اور قرآنی تعلیمات کا لب لباب اپنے اندر لئے ہوئے ایک کتاب "The Mind Al-Quran Builds" کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے دل کی پکار ہے اور آپ کا بہترین شاہکار۔ عہدِ حاضر میں اعلاءِ کلمۃ الحق کی یہ ایک نہایت ہی ممتاز اور جرأت آمیز کوشش ہے اور وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی یہ گراں قدر تصنیف صحیح معنوں میں احیائے افکار اسلامی کا سنگِ بنیاد رکھتی ہے۔

میں اُوپر عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی اس انگریزی تصنیف کو شائع ہوئے تقریباً تین سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت کیا تھی ہی انگریزی داں دنیا نے جس میں مشرق و مغرب کے اربابِ علم و اربابِ صحافت

شامل ہیں، اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے احساسات و تاثرات کا اظہار فرمایا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان میں سے چند ممتاز شخصیتوں کے آراء و تاثرات کے نمونوں کو یہاں پیش کردوں تاکہ ناظرین کو اس کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہوسکے۔

امریکہ کی مشہور یونیورسٹی اگل تھاریپ کے چانسلر ڈاکٹر فلپ ولٹنر جو مسیحی دنیا میں اپنے علم و فضل کے اعتبار سے نہایت ہی احترام اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، اپنے ایک مکتوب میں مصنف کو لکھتے ہیں:۔
"آپ کی کتاب میں ایک بھی بات ایسی نہیں جس سے مجھ جیسا کوئی بھی آدمی باوجود اس کے کہ اس نے مسیحی عقائد و روایات کی روشنی میں نشو و نما پائی ہو پورا پورا اتفاق نہ کرے۔"

جرمنی کا مشہور مستشرق پروفیسر گلا سیناپ (ٹیوبنگن یونیورسٹی) اس کتاب کو اسلام کے تمام اہم اور عالمگیر حیثیت رکھنے والے امور کی قابل قدر نمایندگی کرنے والی کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔ "میں نے آپ کی دلآویز کتاب محویت انگیز دلچسپی کیساتھ پڑھی۔ آپ کے تبحر علمی، آپ کی وسیع المشربی اور آپ کے سادہ اور دلکش اسلوب بیان نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مایہ ناز تصنیف سے اپنی کتاب "پانچ بڑے مذاہب" کی اشاعت تک لاعلم و بے خبر رہا۔ آپ کے دین کے ان تمام امور کے متعلق جو اہم ہیں اور عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں، آپ کی ممتاز نمائندگی نے

میری آئندہ تصنیف کیلئے نہایت قیمتی اور قابلِ قدر اشارات فراہم کئے ہیں۔"

امریکہ کے حکومتی محکمہ تحقیق فراست نفسیہ کے صدر ڈاکٹر ای، یم گرک پیٹرک جن کا اہم فرض دنیا کے نفسیاتی رجحانات پر کڑی نگرانی رکھنا ہے، اپنے مکتوب میں اعتراف کرتے ہیں:۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب گویا مشرق و مغرب کی کشمکش میں قرآن کو نمایاں اہمیت دینے کی ایک نہایت ہی دلچسپ کوشش ہے۔ آپ نے اپنے دعویٰ کی اساس کو نہایت ہی قوی اور معقول انداز میں پیش فرمایا ہے۔"

پنڈت سندر لال دہلی سے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ نے نہایت سچائی اور قابلیت اور محنت کیساتھ قرآن کا ایک ایسا انٹرپریٹیشن پیش کیا ہے جو سچ بھی ہے اور جس کی اس وقت ضرورت بھی ہے اور جو بہتوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب کو بہت سے لوگ پڑھیں، ہر مذہب کے لوگ پڑھیں اور خاص کر اس ملک کے زیادہ سے زیادہ وہ لوگ پڑھیں جو اپنے کو مسلمان نہیں سمجھتے۔"

پونہ کے مشہور و معروف سادھو ٹی، یل، وسوانی جو اپنے علم و فضل اور مرتبہ کے اعتبار سے خاص وقعت کے حامل ہیں اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "آپ کی کتاب شروع سے آخر تک دلآویز ہے۔ میں خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ ہندوستان اور انسانیت کی خدمت کیلئے اپنا فضل زیادہ سے زیادہ

آپکے شامل حال رکھے۔ روحانی خزانوں سے آپکا دل و دماغ مالا مال ہے۔ خدا کرے کہ آپ ہمیں اور زیادہ سے زیادہ ان پوشیدہ خزانوں سے مستفید فرمائیں جبکہ آج منفرد اشخاص اور اقوام ہردو اس حکمت و دانائی کے بھوکے اور آرزومند ہیں جو زخموں کو مندمل کرنیوالی اور شفا بخشنے والی ہے۔"

اخبار ہندو مدراس اپنے تنقیدی کالم میں لکھتا ہے: "ڈاکٹر لطیف کی جدید انگریزی تصنیف اسلام کی صحیح توضیح و ترجمانی کرنے والی ان بہترین کتابوں میں سے ایک ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ موصوف ایک فکر صحیح اور نہایت ہی حساس بصیرت رکھنے والے مصنف ہیں۔"

ٹائمس آف انڈیا بمبئی رقمطراز ہے: "قرآنی اصول کی توجیہہ و تشریح میں ڈاکٹر لطیف نے اپنے فکری توازن اور اپنے عمیق علمی تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی توجیہہ شکوک و مشتبہ رجحانات اور ازمنہ وسطی کے تاثرات سے پاک و مبرا ہے۔"

نواب سر نظامت جنگ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: —
"آپ کو میری دعاؤں کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بھلا میں آپ کو کیا دعا دے سکتا ہوں جبکہ آپنے اپنی خدمتِ اسلام سے اس ذات کی خوشنودی حاصل کر لی ہے جو سب سے اعلیٰ و ارفع ہے اور جس کا میں بھی ایک حقیر نغمہ سنج ہوں۔"

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی پرنسپل کلکتہ مدرسہ (عربک کالج) کلکتہ، لکھتے ہیں: — "آپ کی کتاب بلا شبہ خیال انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ آپنے اس کتاب کے ذریعہ درحقیقت اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور عہد جدید کیلئے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ وہ اسلام کو اس کے

اپنے صحیح تناظر اور اصلی رنگ میں سمجھ سکیں۔ اللہ جل شانہ آپ کو اسلام اور انسانیت کی خدمت کیلئے صحت و عافیت کیساتھ دیر یر سلامت رکھے"

اسلامک ریویو لندن اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے:۔ "اس بیش بہا کتاب سے مصنف دنیائے ادب اور دنیائے اسلام میں اچھی طرح متعارف ہیں۔ موجودہ تصنیف موصوف کا بہترین شاہکار ہے۔ مصنف اپنی اس روح پرور کتاب کے لئے ہر طرح قابلِ مبارکباد ہیں۔ مسلمانوں کے ہر گھر اور ہر کتب خانہ میں یہ کتاب ضرور موجود رہنی چاہیئے"

جمعیۃ العلماء کا اخبار "صبح" جو دہلی سے شائع ہوتا ہے، رقمطراز ہے:۔ "کوئی بھی ریویو یا تبصرہ نہ تو اس کتاب کی صحیح قدر دانی کر سکتا ہے اور نہ اس کو حقیقی داد دے سکتا ہے۔ ہماری رائے میں اسلام کیساتھ گزشتہ ایک ہزار سالہ ناانصافی و غلط نمایندگی کے بعد یہ کتاب درحقیقت اسلام کو اس کے اپنے اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنے والی سب سے پہلی صحیح اور ممتاز کوشش ہے"

"اسلامک لٹریچر" لاہور لکھتا ہے:۔ "موجودہ کتاب میں ڈاکٹر لطیف کا مقصد صرف علمی نہیں بلکہ عملی ہے جیسا کہ وہ اپنے مطالعہ اور تحقیق کے ذریعہ جدید سائنٹفک خیال اور قرآن کی اثر آفریں تعلیمات کی روشنی میں ہماری اپنی ثقافتی زندگی اور ہمارے اپنے نظام مدنی کی تعمیر و تشکیل جدید کیلئے منصفانہ تجاویز پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے دعویٰ کو محکم دلائل سے ثابت

کرتے ہیں اور اپنے پڑھنے والے کو اپنے خلوص مقصد، اپنی وسعتِ نظر اور اپنے جامع اور غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر کیساتھ اپنا دعویٰ منوا دیتے ہیں۔"

الٰہ آباد کے مشہور ادبی نقاد ڈاکٹر حفیظ سیّد اپنے ریویو میں لکھتے ہیں:

"ایک ایسے ساکت وصامت ماحول اور ایک ایسی تاریک فضاء میں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ایک وسیع دنیا کے مسلمانوں پر چھا چکی ہے، (ڈاکٹر لطیف کی) یہ کتاب گویا تازہ ہوا کا ایک جھونکا اور روشنی کی ایک کرن ہے۔"

مذکورالصدر آراء و تاثرات سے ڈاکٹر صاحب کی اس انگریزی تصنیف کی قدر و قیمت اور بلالحاظ مذہب و ملت اس کے قبول عام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس گراں قدر تصنیف کے ذریعہ اسلام کی ایک اہم اور شاندار خدمت انجام دی ہے اور اپنے مخصوص دلکش انداز میں ساری دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر اور تعلیماتِ قرآنی کی حقیقی روح کو پیش فرمایا ہے۔ عہد حاضر میں یہ کتاب درحقیقت اعلائے کلمۃ الحق کی ایک نہایت ہی بڑھیا اور کامیاب کوشش ہے۔ جہاں آپ نے مسلمانوں کو ان کا اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہوئے بطورِ خاص اس امر کی توجہ دلائی ہے کہ وہ خود اپنا آپ جائزہ لیں، اپنی بے راہ روی سے اغیار کو اسلام پر طعنہ زنی کرنیکا موقع نہ دیں اور صدیوں کے پڑے ہوئے حجابات کو اٹھاکر اسلام اور بانیٔ اسلام کی صحیح تصویر کو دیکھنے اور اپنے آپ کو اس سانچہ میں ڈھال لینے کی کوشش کریں جو قرآن کا پیش کردہ ہے، وہیں آپ نے قرآنی پیام کے عالمگیر ہونے کا

حیثیت سے ساری دنیا کو دعوتِ فکر دی ہے اور وہ طریقے اور راستے بتلائے ہیں جن پر چلکر ہر متنفس ایک متوازن زندگی کا حامل ہو سکتا ہے اور ابدی امن و سکون حاصل کر سکتا ہے۔ آپ نے بطورِ خاص تین اُمور یعنی احساس رب، وحدتِ انسانی اور سنت اللہ کے مطابق عمل پر زیادہ زور دیا ہے جنکا لازمی نتیجہ خشیتِ الٰہی، اپنے اور غیر کے حقوق کا تحفظ، باہمی ربط و اتحاد اور ایک پاکباز متوازن زندگی ہے۔ یہی وہ بنیادی اجزا ہیں جن سے صالح معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور ایک صالح معاشرہ کا وجود بلاشبہ دارین کے امن و سکون کا ضامن ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے یہ افکارِ عالیہ فوری اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسکا ایک نمایاں اثر یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد ہی سے اکثر جگہ سنجیدہ دماغ نئے انداز میں مصروفِ فکر نظر آنے لگے ہیں اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ذی علم نوجوان طبقہ بھی جو بڑی حد تک اپنے مذہب سے برگشتہ اور بیزار ہو چکا تھا اور نئی روشنی سے متاثر ہو کر قریب تھا کہ وہ عہدِ حاضر کے نئے نظریوں سے بالکلیہ ہم آغوش ہو جائے، اب سوچنے اور اپنا آپ جائزہ لینے لگا ہے۔ یہ امید کیجا سکتی ہے کہ سنجیدہ افکار کی یہ بیداری ضرور مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ اس کتاب کا دوسرا اثر ان حلقوں میں نمایاں ہے جہاں عرصہ دراز سے اسلام کی غلط نمائندگی کیجاتی رہی ہے۔ بالخصوص مغربی دنیا کے مسیحی مبلغین اس وقت ایک حیرت انگیز عالمِ سکوت سے دوچار ہیں اس لیئے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بلند پایہ تصنیف نہ صرف اسلام کی بہترین توضیح ثابت ہو رہی ہے بلکہ وہ ایک نہایت ہی موثر انداز میں ببانگِ دہل ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر رہی ہے جو مسیحی مبلغین نے صدیوں سے

اسلام کے متعلق اپنے حلقہ ہائے اثر میں پھیلا رکھی تھی۔ اس کتاب کا ایک تیسرا اثر بھی ہے جو میدانِ سیاست میں کارفرما ہے اور دوررس نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تصنیف کے آخری ابواب میں وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں اور مغربی طاقتوں کو امن و اتحاد کے حصول کے سلسلہ میں انتباہ اور چند مفید مشورے بھی دئے تھے جو اب نتیجہ خیز ثابت ہو رہے ہیں۔ میں یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس انگریزی تصنیف کی اشاعت کے بعد ہی اسکے مطبوعہ نسخے مشرقِ وسطیٰ اور مغربی ممالک کے تمام سربرآوردہ مفکرین اور اربابِ حل و عقد کے پاس تحفۃً ارسال کئے گئے تھے جو ان حضرات کے زیر مطالعہ رہے اور جنہوں نے اپنے اپنے تاثرات سے قابل مصنف کو آگاہ بھی کیا۔ گزشتہ تین سال کے دوران میں مشرقِ وسطیٰ اور مغربی ممالک کی سیاسی دنیا میں جو تبدیلی آہستہ آہستہ رونما ہو رہی ہے اور باہمی ربط و اتحاد کی جو کوششیں کیجا رہی ہیں وہ اربابِ بصیرت کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ وہ وقت دور نہیں جبکہ اس متوقع اتحاد کے تجزیہ اور اس کے اسباب و علل کی دریافت میں علی الاعلان اس حقیقت کو آشکار کرنا پڑیگا کہ اس اتحاد کی تکمیل اور ان کوششوں کی کامیابی میں منجملہ اور عناصر کے ڈاکٹر لطیف کی یہ بلند پایہ انگریزی تصنیف بھی ایک اہم عنصر رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف اور اسکی خوبیوں کے متعلق اور کیا عرض کروں صرف اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں؎

دامان نگہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار ؎ گلچین بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

ترجمہ کے تعلق سے یہاں باقیؔ مرحوم کا مختصر تذکرہ بیجا نہ ہوگا۔ عبدالقیوم خاں صاحب باقیؔ جامعۂ عثمانیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے تھے اور اپنے انتقال سے قبل تک

نظام کالج کے شعبۂ اردو وفارسی میں لیڈری کی خدمت پر فائز و کارگزار تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں انہوں نے اپنے خاص اندازِ بیان کی بدولت نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور نقاد بھی۔ موسیقی سے انہیں خاص ربط تھا اور ستار کے اچھے باجنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ ایک جاذب شخصیت کے حامل اور اپنے رفقائے کار اور طلباء میں ہردلعزیز تھے۔ میں مختصراً ان کے ان خصوصیات کا اظہار کرتے ہوئے انکی عدم موجودگی کو بری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ افسوس کہ وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔

باقی مرحوم کے اچانک انتقال کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے ان کا مسودہ دوسرے باب سے ساتویں باب تک اصل متن سے تقابل کیلئے بعض احباب کے حوالے کیا۔ وہ مقامات جو تشنہ اور باقی رہ گئے تھے انکی بھی تکمیل کرلیگئی۔ اس سلسلہ میں مولوی اصغر حسین صاحب آئی، اے، یس اور انکی بیگم صاحبہ زہرا اصغر حسین ایم، اے نائب پرنسپل ٹریننگ کالج اور مولوی علی موسیٰ رضا صاحب مہاجر وظیفہ یاب صدر مدرس گلبرگہ ہائی اسکول بطور خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان احباب نے ہمدردانہ توجہ فرماکر تقابل و تکمیل کا کام انجام دیا۔

دیباچہ اور پہلے باب کا ترجمہ اس ناچیز کا کیا ہوا ہے جو بجنسہٖ شریک کتاب کرلیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام کراچی نے عام فہم انداز میں آخری باب کا اسکا اپنا کیا ہوا ترجمہ شائع کیا تھا لیکن اس باب کے کچھ حصوں کا ترجمہ رہ گیا تھا۔ طلوعِ اسلام کے ترجمہ کو بجنسہٖ باقی رکھتے ہوئے مابقی حصوں کے ترجمہ کی تکمیل کرکے اسکو بھی شریک کتاب کرلیا گیا۔ انگریزی تصنیف میں قرآن و حدیث کے جو حوالے درج کیے گئے تھے ان تمام کا ترجمہ بھی باقی رہ گیا تھا۔ ناچیز نے اسکی تکمیل کردی۔ غرض اس طرح کتاب کے پورے ترجمہ کی

تکمیل ہوگئی۔ مولوی سید عبدالوکیل صاحب جعفری مولوی فاضل نے از راہِ کرم اس اُردو ترجمہ کا اشاریہ مرتب فرمایا جس کے لئے وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں ڈاکٹر لطیف کی کسی بھی انگریزی تصنیف کا ترجمہ واقعہ ہے کہ کوئی آسان کام نہیں۔ آپکا مخصوص اندازِ بیان ہی ایسا ہے کہ اس کے ترجمہ میں اکثر پختہ کار مترجمین بھی قلم ٹیک دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے اس انگریزی شاہکار کا اُردو ترجمہ تو بطورِ خاص ایک کڑی آزمائش تھا۔ میں اس اظہارِ حقیقت پر اس لئے مجبور ہوں کہ مجھے خود دیباچہ اور باب اول کے ترجمہ میں اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونا پڑا ہے۔ باقی مرحوم نے واقعہ ہے کہ نہایت ہی جرأت آمیز اور حیرت انگیز طریقہ پر اس کام کی تکمیل کی۔ یہ ترجمہ خود ان کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ اس کا امکان ہے کہ بعض مقامات پر دوسروں کا اندازِ تحریر محسوس کیا جاسکے لیکن چونکہ کتاب کے بیشتر حصہ کا ترجمہ باقی مرحوم کا کیا ہوا ہے اور ان کا اندازِ تحریر نمایاں اور غالب ہے، اسی لئے اس ترجمہ کو باقی مرحوم ہی کے نام سے منسوب کرکے شائع کیا جارہا ہے۔ گو باقی ہم میں باقی نہیں لیکن یہ ترجمہ ضرور انکی یاد کو باقی رکھیگا۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے، آمین۔

خاکسار
محمد راحت اللہ خاں

المرقوم ۱۸؍ نومبر ۱۹۵۵ء
حیدرآباد دکن

دیباچہ

ہم کو اپنی مختصر سی زندگی کے دوران میں دو عالمگیر جنگوں کا تجربہ ہو چکا ہے اور اب ہم قدرتی طور پر ایک تیسری عالمگیر جنگ کے منتظر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ پہلی جنگ میں جو فتح مند ہوئے انہوں نے ساری جنگوں کے سلسلہ کو ختم کرنے کے متعلق باتیں کرنی شروع کیں اور مجلس اقوام کے نام سے امن کی ایک مشینری قائم کی لیکن جب یہ مشینری بھی کچھ کارآمد ثابت نہ ہو سکی اور انہوں نے اپنے آپکو پھر ایک دوسری جنگ میں جو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ سنگین اور خطرناک تھی، معروف پایا اور جب اس میں دوبارہ کامیاب و کامران ہوئے تو پھر انہوں نے جنگوں کے خاتمہ کے متعلق اپنی سابقہ گفتگو کی طرف عود کیا اور اس امید کیساتھ کہ حالات میں ضرور بہتری پیدا ہو جائیگی اور دنیا امن کی طرف لوٹ آئیگی، مجلس اقوام متحدہ (یو، ین، او) کے نام سے امن کی ایک دوسری مشینری قائم کی۔ لیکن یہ امن ہنوز قریب نظر ہے۔

سائنس کے کمالات اور اسکی کامیابیوں نے آج ہمارے لئے زمان و مکان کے قدیم قیود و موانع کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اس وسیع کرۂ ارض کو ایک ایسے چھوٹے سے مکان کی صورت میں محدود کر دیا ہے جہاں ہلکی سی سرگوشیاں بھی ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک برابر سنی جا سکتی ہیں۔ بنی نوع انسان کیلئے اس سے قبل ایسا بہتر موقع حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ باہم قریب تر ہو جائیں اور حضرت مسیحؑ کے تصور کے مطابق یہ ثابت کریں کہ

وہ تمام "اللہ کے بچے" ہیں یا پیغمبر اسلام کے ارشاد کے مطابق اس کا ثبوت دیں کہ وہ تمام ایک ہی خاندان کے افراد یعنی "عیال اللہ" ہیں جن میں "ہر فرد باہم ایک دوسرے کا بھائی ہے"۔ لیکن ہنوز یہ چھوٹا سا مکان منقسم حالت ہی میں قائم اور دو ایسی زبردست حریف قوتوں کا شکار بنا ہوا ہے جن میں سے ایک کی نمائندگی سوویٹ روس کرتا ہے تو دوسری کی ممالک متحدہ امریکہ اور تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی مجلسِ امن کے ارکان بھی ہیں۔

آخر یہ صورتِ حال کب تک برقرار رہیگی؟ کہا جاتا ہے کہ یہ آویزش دراصل تصورات کی آویزش ہے۔ کیا یہ امر واقعہ ہے؟ بلاشبہ روسیوں کے پاس بھی امریکیوں کی طرح امن کی ایسی اصطلاحات موجود ہیں جو ان کے فطری خوفِ جنگ اور تمنائے امن کا اظہار کرتی ہیں۔ روسی حکمراں بھی، دوسری جماعت کے ان ارباب حل و عقد کی طرح جو حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں، عوامی جمہوریت کی ہمنوائی کرتے ہیں اور انہی کے مماثل سامراجیوں اور جنگ بازوں سے یکساں تنفر کے مدعی نظر آتے ہیں۔ بہرحال ہر دو کا مقصد بظاہر عام انسان کیلئے ایک بلند معیارِ حیات کا حصول ہے۔ اگر مشترکہ طور پر نیک نیتی اور خیر سگالی کے جذبہ سے کام لیا جائے تو ایسے دو تصورات میں جن کا مقصد ایک ہی ہو، ہم آہنگی اور مصالحت ناممکن نہیں۔ اگر فی الحقیقت ہر جزو پر مصالحت ممکن نہ ہوسکے تو یقیناً یہ تو ہوسکتا ہے کہ ہر دو تصورات ممکنہ تعاون اور رواداری کی اساس پر ساتھ ساتھ کام انجام دے سکیں۔ لیکن مجلس اقوامِ متحدہ نے جسکا فرضِ منصبی یہ تھا کہ وہ اپنے اراکین کی باہمی کشیدگی کو

دُور کرے اور ان میں مفاہمت پیدا کرنے ، ہنوز کوئی ایسا نمایاں اقدام نہیں کیا ہے جس سے ان دونوں میں مصالحت اور ہم آہنگی پیدا ہو جانے کا امکان ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود مجلس کی آنکھوں کے سامنے روزانہ دن دہاڑے ہر دو جانب جنگی اسلحہ کے انبار لگ رہے ہیں۔ ایک "سرد جنگ" تو پہلے ہی سے جاری ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ آویزش قطعاً عام انسان کی معاشی اصلاح کی تائید میں نہیں اور فی الحقیقت یہاں کسی آئیڈیولوجی یا اعلیٰ تصورِ حیات کا الجھاؤ بھی نہیں ہے۔ ہر حالت میں عام انسان تو ان دونوں فریقوں کا مرکزِ فکر ہے ہی نہیں۔ تو پھر آخر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ گو صورتِ حال کے پیشِ نظر میں اپنے آپ کو ڈیوک آف آلبنی کی ہمنوائی کیلئے آمادہ نہیں پاتا جب کہ وہ شکسپیر کے ڈرامے کنگ لیر (King Lear) میں ماحول سے متاثر ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ "یہ وقت کی لعنت ہے کہ دیوانے اندھوں کی رہبری کر رہے ہیں" تاہم میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس صورتِ حال کا جواب اسی مقولے کے قرب و جوار میں کسی جگہ ضرور موجود ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ "نیکوکار (صالحین) اس زمین کے وارث ہوں گے" یعنی وہ لوگ جو زندگی میں توازن قائم رکھتے ہیں اور اس کو ہر قسم کی بیجا اندوزی سے بچاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بحیثیت "نائب خدا" اس زمین پر اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور اس قانون کے اجراء و قیام کا باعث ہوتے ہیں جو کائنات میں کارفرما ہے۔ کہیں یہ تو نہیں کہ ہم میں اس قسم کی ہستیوں (صالحین) کا قحط ہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آویزش دراصل ایک ایسی مسابقت ہے جو اندھوں کی رہبری کرنے والوں کے درمیان ہوا کرتی ہے۔

آج کل ہر جگہ مسلک قومیت ایک بانکپن کے ساتھ کچھ اس طرح سرگرم خرام ہے کہ وہ مخصوص اقوام کے اغراض و مقاصد کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس اہمیت کو مساوی طور پہ بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کے اغراض و مقاصد تک وسعت دینے کیلئے آمادہ نہیں۔ عہد حاضر کی جمہوریت کے تار و پود میں خلط ملط ہو کر اس مسلک نے حق رائے دہی کے جمہوری اصول کو ایک پست اور گھٹیا صورت دیدی اور صالحین کے برسر عروج آنے اور اپنے اپنے ملکوں کے معاملات کی قیادت و رہنمائی کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالدی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو پیغمبر اسلام کے تصور کے مطابق ایک متحد بنا ہونے اور ایک ایسی جماعت بننے سے باز رکھا جس کا "ہر فرد ہر دوسرے فرد کا محافظ و نگہبان اور پوری جماعت کی فلاح و بہبود کا جواب دہ ہو"۔ مجلس اقوام متحدہ کو کامیاب بنانے کیلئے آج ہمیں ایک ایسے ہی نگہبانی کرنے والے ذہن کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ مجلس بھی وہی راہ اختیار کریگی جو اس کے اسلاف نے اختیار کی تھی اور بین الاقوامی جاسوسی کے ایک اڈے کی طرح تھوڑی سی اکڑفوں کے بعد ختم ہو جائیگی۔ اتحاد و تمدن کے مفادات کی راہ میں سرمایہ داری یا اس کے شدید ردعمل کا نتیجہ یعنی اشتراکیت میں سے کوئی ایک ہی حائل نہیں بلکہ ان دونوں کا شدید تفاعل ہی جنکی پشت پناہی بھی مشترک جذبۂ قومیت کر رہا ہے، دراصل اس راہ میں حائل ہے۔

اس برائی کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنا یا اس کو انسانیت آموز بنانا یہ ایک مذہبی فریضہ ہے اور یہ مذاہب عالم ہی کا کام ہے کہ وہ اس فریضہ کی انجام دہی میں صحیح رہبری کریں۔ کچھ عرصہ سے ان مذاہب کو پس پشت ڈالا گیا ہے اور انکی جگہ پر غیر مذہبیت

(Secularism) کا بت نصب کر دیا گیا ہے گویا کہ غیر مذہبیت خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، بلا کسی روحانی اساس کے کوئی دیرپا چیز ہو سکتی ہے۔ انجام کار مذہب ہی کو اس کے لئے اس اساس عمل کا انتظام کرنا ہوگا، ورنہ بلا اساس روحانی یہ غیر مذہبیت، قومیت سے پیدا ہونے والی برائیوں کے اضافہ کا باعث ہوگی اور حیات انسانی کو اور زیادہ فاسد کر دیگی۔ آج انسان کا واحد ملجا یہی ہے کہ وہ ہر مذہب کے اتحادی عنصر کی طرف لوٹ آئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ اصل مذہب سے حشو و زوائد کو علیحدہ کر دیا جائے۔ مذہب جس وحدت ربانی پر زور دیتا ہے اس کو قرآن کے منشاء کے مطابق وحدت انسانی یا انسان کیلئے ایک پر امن نظام حیات کی صورت میں رونما ہونا چاہیئے یہی اس کا صحیح فریضہ ہے۔ وہ لوگ جو اس نقطہ نظر کے حامی ہیں ان کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے اپنے مختلف مذاہب کی ان امکانی قوتوں کا جو ان میں مضمر ہیں، مطالعہ کریں اور انکو منظر عام پر لے آئیں تاکہ اس نگہبانی کرنے والے ذہن کو ترقی دی جا سکے جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے۔ نیز دنیا کے ہر گوشہ میں صالحین کی ایک ایسی جماعت پیدا کریں جو متفقہ طور پر اپنی مساعی سے حیات انسانی کو اس کا کھویا ہوا توازن واپس دلانے اور ایک متحد دنیا کو معرض وجود میں لانے کیلئے راہ ہموار کر سکے۔

چونکہ میں قرآن کے دین پر پیدا ہوا ہوں اور میں نے اسی کے ماحول میں نشوونما پائی ہے اس لئے یہ امر میرے لئے فطری اور آسان تھا کہ میں قرآن کے مہیا کردہ امکانات کا جن سے آج کی دنیا کیلئے اس نگہبانی کرنے والے ذہن کو تشکیل دیا جا سکتا ہے مطالعہ کروں۔ میرا یہ مطالعہ فی الحقیقت ایک مطالعہ امعانِ نفس ہے اور اس سے مقصد

دیباچہ

ان اقدار حیات کی یاد دہانی ہے جنکو میرے ہم مذہب بھائیوں نے مرورِ زمانہ کے ساتھ بڑی حد تک اپنے سے علیحدہ کر دیا ہے۔ میں نے اس کام کو نہایت ہی انکسار اور اپنے حدود کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس جستجو کے دوران میں مجھے بڑی نازک راہوں سے گزرنا پڑا اور ان جذبات سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑا جن کو میرے بھائیوں نے اپنے سینوں کی گہرائی میں جگہ دے رکھی ہے۔ میرے اس عمل کی تائید میں صرف ایک ہی چیز ہے اور وہ میرے اپنے دل کی یہ لگن ہے کہ میں جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکے ان حجابات کو اٹھاؤں جنکو عرصۂ دراز سے قرآن پر پڑے رہنے دیا گیا ہے تاکہ قرونِ وسطیٰ کے غیر قرآنی اثرات سے آزاد ہو کر قرآن اپنا پیام خود اپنے انداز میں سنا سکے۔ اب ان ارباب علم کا جو بہتر صلاحیتوں کے حامل ہونے کے باوجود اس وقت تک خاموش رہے ہیں، یہ فریضہ ہے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیں، اور ذہن کی اس تصویر کی تصحیح، توسیع اور تکمیل کریں جس کا خاکہ میں نے یہاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور جسکو قرآن انسان کیلئے تشکیل دینا چاہتا ہے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں میں اپنے دو احباب کا شکرگزار ہوں جن سے مجھے گران قدر مدد ملی۔ ایک میرے قدیم رفیق اور جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد کے پروفیسر علامہ عبدالقدیر صاحب صدیقی ہیں جو عرصہ دراز تک اسلامی شعبۂ دینیات کے صدر رہے ہیں اور جنکے قرآنی علم کی ہمیشہ میرے دل میں بڑی وقعت رہی ہے۔ گو آپ قدیم طرز کے علماء کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن بایں ہمہ آپ اس خوبی کے بھی حامل ہیں کہ علوم دینیہ کے سرچشموں تک پہنچنے کیلئے نئے اسلوب سے فکر کرنے والوں کے

عزائم کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے میرے اندازِ فکر اور خیالات سے جو قرآن کے پیش کردہ اساسی مسائل حیات سے وابستہ رہے ہیں ہمیشہ ہمدردانہ رجحان کا اظہار فرمایا اور میری ہمت افزائی فرمائی۔ دوسرے دوست جن کا میں ممنون ہوں ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب (ایم، اے) عثمانیہ (ڈی فل لیبزگ) کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ ہیں۔ آپ ان جدید مسلم ارباب علم میں سے ہیں جو ہمارے قرون وسطیٰ کے مذہبی ورثہ سے پوری ہمدردی نہیں رکھتے اور ساتھ ہی ساتھ تہذیب جدید کے رجحانات سے بھی مطمئن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ انگریزی میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں اور انھوں نے اپنے استاد کے ساتھ اپنے قدیم جذبۂ محبت کو علیٰ حالہ برقرار رکھا ہے۔ میرے اس کام کی دشواریوں کا آپ کو عمیق احساس رہا ہے اور آپ نے میرے لئے کتب خانہ آصفیہ میں جہاں میرے کام کا بیشتر حصہ تکمیل پایا، ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں۔ میں بخوشی اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ عربی ادب سے متعلق جو ان کے تحصیل علمی کا خاص موضوع رہا ہے، میں نے ان کی وسیع اور متنوع معلومات سے آزادی کے ساتھ استفادہ کیا ہے۔

گو مجھے اپنے مقالہ کی پیشکشی میں ان دو احباب کی ہمدردیوں کا بخوبی احساس ہے تاہم میرے لئے یہ امر قرین انصاف نہ ہوگا کہ میں انہیں بھی اُس ذمہ داری میں شریک کروں جو ان افکار و آراء کے اظہار سے جو اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں، عائد ہوتی ہے، ان افکار کا صرف میں ہی تنہا ذمہ دار ہوں کیونکہ یہ افکار حقیقتاً میرے ہی ساتھ نشو و نما پائے ہیں اور اب تو یہ میرا ایک جزو حیات بن چکے ہیں

آخر میں میں ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ریڈر شعبۂ ثقافت و تہذیب جامعۂ عثمانیہ کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے بڑی احتیاط سے اس کتاب (انگریزی تصنیف) کا اشاریہ مرتب کیا۔

سیّد عبد اللّطیف

باب اوّل
قرآن قرونِ وسطیٰ کے شکنجہ میں

آج تقریباً دنیا کے ہر گوشہ میں ذہنِ مسلم ایک متاعِ کاسد قرار دیا جا رہا ہے۔ اسکی اپنی اختیار کردہ زندگی اور اُس زندگی میں جس کے اختیار کرنے کی قرآن اس کو تاکید کرتا ہے، ایک فصل ہے۔ قرآن کا منشاء ہے کہ وہ اپنے لئے مخصوص سماجی اور سیاسی اداروں کی بناء ڈالے لیکن ان قرآنی اداروں اور ان اداروں میں جن کی خود اس نے اپنے لئے بناء ڈالی اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا، ایک فصل ہے۔ عہدِ حاضر کے مسلمانوں کے مقصد اور قرآن کے ابدی مقصد میں جو بالکلیہ عالمی مقصد ہے، ایک فصل ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن کی عالمگیر انسانیت اور عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی تخفیفی مذہبیت ہر دو میں ایک بڑا فصل ہے۔ اگر کوئی اُن لوگوں کی زندگیوں کا تجزیہ کرے جو دوسری مقدس مذہبی کتابوں پر اعتقاد رکھنے کے مدعی ہیں اور بہتر ہو گا کہ ہر مذہب کا کوئی مخلص پیرو اس کام کو اپنے ذمہ لے، تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہو گا اگر اس کو بھی ان میں اسی قسم کے فصل نظر آئیں۔

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں خلیفہ حضرت عمرؓ کی زندگی کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔ حضرت عمرؓ مدینہ سے مکہ تشریف لیجا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں

ایک دن علی الصباح آپ نے ایک پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کا ایک گلہ دیکھا۔ ایک حبشی لڑکا اسکی رکھوالی کر رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے خاطر کہ آیا تعلیمات قرآنی کم از کم اپنی عمومی شکل ہی میں سہی، ملک عرب کے اس دور افتادہ گوشہ میں رہنے والے اس حبشی لڑکے تک پہنچی ہیں یا نہیں اور اگر پہنچی ہیں تو اس لڑکے نے اپنی انفرادی زندگی میں کہاں تک ان تعلیماتِ قرآنی کے اثر کو قبول کیا ہے، آپ نے اس لڑکے سے پوچھا کہ کیا وہ اس گلہ کی ایک بھیڑ فروخت کریگا۔ اس لڑکے نے قطعیت کے ساتھ فوراً جواب میں کہا "نہیں"۔ "آخر وہ کیوں نہیں" خلیفہ نے پوچھا۔ لڑکے نے جواب دیا "اس لئے نہیں کہ یہ بھیڑیں میری نہیں بلکہ میرے آقا کی ہیں اور میں اس کا غلام ہوں"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "کیا مضائقہ ہے؟ لو یہ رقم لو اور ایک بھیڑ مجھے دیدو اور اپنے آقا سے جاکر کہدو کہ کوئی بھیڑیا اس کی ایک بھیڑ اٹھالے گیا ہے"۔ یہ سن کر اس لڑکے نے اپنی نظریں خلیفہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس غریب کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس ہستی کو اس طرح گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اسی حالت میں اس لڑکے نے زوروں سے کہا "میں اپنے آقا کو جو پہاڑی کے اس جانب ہے دھوکا تو دے سکتا ہوں لیکن کیا میں اس بڑے آقا کو بھی جو ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری باتوں کو سن رہا ہے اسی طرح دھوکا دے سکتا ہوں؟" یہ لڑکا ایک ان پڑھ لڑکا تھا۔ اس نے قرآن کی کبھی بھی تلاوت نہیں کی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کے ماحول کا اثر اس کے ذہن تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی انداز میں ضرور یہ قرآنی الفاظ سنے ہونگے کہ "اللہ اس سرگوشی کو بھی جانتا ہے جو آدمی کا نفس اسکے ساتھ کرتا ہے" اور یہ کہ "اللہ آدمی سے

اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے" اور یہ کہ "کوئی تین آدمی باہم چپکے چپکے گفتگو نہیں کرتے مگر یہ کہ اللہ ان میں چوتھا ہے اور نہ کوئی پانچ مگر یہ کہ اللہ ان میں چھٹا ہے، اور نہ کم اور نہ زیادہ لیکن جہاں کہیں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہے"! اس نے یہ بھی ضرور سنا ہوگا کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کو جو اس کی اپنی نہیں ہے نہ تو کسی دوسرے کو دے سکتا ہے اور نہ اس کو فروخت کر سکتا ہے۔ اس حبشی لڑکے کے جواب نے حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر اور سخت گیر خلیفہ کے ذہن پر جو اثر مرتب کیا ہوگا اس کا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ کے رخسار پر آنسو ڈھلک آئے۔ آپ نے شفقت کے ساتھ اس لڑکے سے کہا کہ مجھے اپنے اس مجازی آقا کے پاس لے چل جو اس گلہ کا مالک ہے۔ اس کے آقا سے ملنے پر آپ نے دریافت فرمایا "تم نے اس غلام کی کیا قیمت ادا کی ہے"؟ "اس قدر" اس کے مالک نے جواب دیا "لو" فرمایا حضرت عمرؓ نے "یہ اُس قدر قیمت لے لو اور اس لڑکے کو آزاد کر دو"۔ لڑکا تو آزاد ہوگیا اور حضرت عمرؓ نے اپنی راہ لی۔ لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر مسلک میں ہم میں سے کتنوں نے خواہ مسلم ہوں کہ غیر مسلم، ہماری جامعات کی پیدا کردہ کتنی ایسی ذہین اور قابل ہستیوں نے، نیز اُن میں سے کتنے ایسے افراد نے جو آج اپنے اپنے ملکوں کی عنان حکومت سنبھالے ہوئے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ان میں سے کتنوں نے جو منشور اقوام متحدہ اور حقوق انسانی کے عالمگیر اعلان پر اپنے دستخط ثبت کئے ہیں، ذہن کے اس مرتبہ یا اُس حالت تک رسائی حاصل کر لی ہے جس پر یہ حبشی لڑکا آج سے تیرہ سو سال قبل پہنچ چکا تھا یا

اس حبشی لڑکے کی طرح ذات باری کا احساس کیا ہے اور اپنے آپکو اپنے رب کے سامنے ان تمام اُمور میں جو انہوں نے اپنی مختلف زندگیوں میں سوچے یا کئے ہوں ذمہ دار ٹھہرایا ہے؟

یہی وہ احساس ذاتِ باری ہے جسکو قرآن قلب انسانی میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسی پر معاشرہ کا ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں سماج کا ہر فرد ”ہر دوسرے فرد کا محافظ و نگہبان“ ہو سکے گویا ایک ایسی برادری اور بھائی چارگی قائم ہو جو اپنی انتہائی وسعت میں بلا لحاظ زماں و مکاں جمیع بنی نوع انسان پر جو در حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ”عیال اللہ“ ہیں، حاوی ہو۔ مملکت مدینہ جس کی نبی کریم صلعم نے تشکیل فرمائی اور جو بعد میں خلفائے اسلام کو ورثہ میں ملی، اس کی نشوونما ابتداءً ایسے جمہوری نظریہ کے تحت عمل میں آئی جو اپنی ترکیب اور ہئیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر قدیم یونانیوں کے جمہوری نظریہ سے بالکل مختلف تھا۔ یہ جمہوری نظام ایسے منفرد اشخاص پر مشتمل تھا جنہوں نے فطرت انسانی کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے باہمی فضیلت کیلئے بجز حیات صالح کے کسی اور معیار کو تسلیم نہیں کیا اور جن کا سنجیدہ مقصد یہ تھا کہ فطرت انسانی کے مادی اور روحانی تقاضوں میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے اور زندگی میں ایک ایسی روح پھونکی جائے کہ وہ جمیع بنی نوع انسان کیلئے ایک متحدہ مسرت کو رونما کر سکے۔

بہرحال یہ جمہوری نظام زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکا جوں ہی کہ یہ مملکت حدود عرب سے آگے پھیلی اور اس نے ایک سلطنت کی صورت اختیار کر لی، تو وہ خلافت

بھی جس کا آغاز بحیثیت ایک انتخابی ادارہ کے ہوا تھا، بہت جلد ایک خود مختار موروثی شاہی میں متبدل ہو گئی۔ اس تغیر اور اس عبوری دور کی نمایاں خصوصیت باہمی خانہ جنگیاں تھیں۔ مسئلہ خلافت اس سارے جھگڑے کا سبب تھا۔ چونکہ اس منصب کیلئے بلحاظ اسکی ہیئت کے مخصوص مذہبی فرائض کی انجام دہی ضروری تھی اس لئے اس کشمکش نے قدرتی طور پر مذہبی صورت اختیار کر لی۔ نیتوں کی جانچ اور ذمہ داریوں کے تعین کا یہ محل نہیں۔ درمیانی تکلیف دہ صدیوں کو عبور کر کے ان چیزوں کی خواہ مخواہ کھوج کرنا کوئی سود مند فعل نہیں۔ بہرحال نتیجتاً اسلام فرقہ بندی میں مبتلا ہو گیا۔ خانہ جنگیوں کے دوران میں قرآنی تصورات سے گریز کرنے کا جو رجحان پیدا ہو چلا تھا وہ اموی اور عباسی عہد کی موروثی خاندانی خلافت کے دور میں شدید تر ہو گیا اور دیگر بیرونی ثقافتی اثرات سے خلط ملط ہو کر یہ رجحان اسلام کے روایتی بہتّر فرقوں کے روپ میں نمایاں ہوا۔ اس رجحان کے شاخسانے کے طور پر، ونیز اس کو پرورش کرنیوالی قوت کی حیثیت سے مختلف فرقوں کے سرگرم طرفداروں میں یہ عام میلان پیدا ہوا کہ جہاں استدلال عاجز آ جائے وہاں رسول کریم صلعم کے نام کا سہارا لیا جائے اور اپنے حریفانہ دعاوی اور نقاط نظر کی تائید میں ایسے اقوال و افعال کو رسول کریم صلعم سے منسوب کیا جائے جو بالکلیہ انہی کے زرخیز متخیلہ کے پیداوار تھے۔ چنانچہ اس قسم کے قصوں کے گھڑے جانے کی تیز رفتاری کو دیکھ کر پیروان اسلام کے سنجیدہ افراد گھبرا اٹھے۔ انھوں نے اس میلان کے سدباب کا بیڑا اٹھایا اور قرآن اور رسول کریم صلعم کی تصویر کو مسخ ہونے سے

بچانے کا تہیہ کرلیا۔ یہ کام کس قدر مشکل تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب امام بخاریؒ نے تحقیق و تفتیش کے ساتھ اصل اور مستند احادیث کو موضوع اور غیر مستند احادیث سے علیٰحدہ کرنا اور صحیح احادیث کو مدوّن کرنا شروع کیا تو انہیں ان چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو حسبِ روایت ابن خلکان ان کے دائرہ وقوف میں آئیں، ایک روایت کے موجب صرف (۷۳۹۷) اور دوسری روایت کے بموجب (۷۲۹۵) حدیثوں کے سوا باقی تمام روایات کو جعلی اور ناقابل اعتبار قرار دیکر خارج کر دینا پڑا۔ اور پھر مختلف ابواب سے اگر مکررات کو علیحدہ کر دیا جائے تو صحیح احادیث کی یہ تعداد گھٹ کر صرف (۲۷۶۲) رہ جاتی ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنے انتخاب کا جو معیار مقرر کیا وہ زیادہ تر رواۃ حدیث کی راست گوئی پر مبنی تھا نہ کہ متن حدیث کی نوعیت پر۔ اور اس سے شائد ان کا یہی مقصد تھا کہ مستند و معتبر رواۃ کی فہرست سے ان تمام غیر مستند رواۃ کو خارج کر دیا جائے جنہوں نے جعلی حدیثیں تراشنا اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ پھر بھی اس احتیاط اور دیانت داری کے باوجود جو رواۃ کے انتخاب میں برتی گئی، داخلی شہادت کی بناء پر یہ کہنے کی معقول گنجائش موجود ہے کہ امام بخاریؒ اور انکے ہم شمار محدثین کے مجموعۂ احادیث میں ہنوز چند ایسی بھی روایات موجود ہیں کہ اگر ان کو صحیح اور قابل تسلیم قرار دینا ہی ہے تو ضروری ہوگا کہ سائنٹیفک علمی طریقۂ تحقیق سے انکی صحت کی توثیق کرلی جائے۔

عام طور پر احادیث کو قرآن کے بعد سب سے زیادہ اہم اور متبرک قرار دیا جاتا ہے۔ اور بعض حلقوں میں تو ان کو قرآن پر بھی ترجیح دیجاتی ہے۔ ابتداءً

اس کا مقصد یہی تھا کہ یہ ذخیرہ قرآن کے ان احکام واوامر کے تعلق سے جنکو بطور کلیہ بیان کیا گیا ہے، نبی کریم صلعم کے عمل کی یادداشت کا کام دے سکے۔ اسکا مقصد احکام الٰہی کی توضیح وتشریح بھی تھی اور یہ بتانا بھی تھا کہ وحدتِ امت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان نئے حالات میں جو پیروان اسلام کی زندگی میں پیدا ہوں کس طرح انکو روبہ عمل لایا جاسکے۔ لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، بہت جلد کسی نہ کسی رجحان کے تحت اسکے مآل پر غور کئے بغیر اس مقصد میں اتنی وسعت پیدا کردی گئی کہ بالآخر نبی کریم صلعم کے وصال کے تین سو سال کے اندر ہی روایات کا یہ جدید ذخیرہ قانون، دینیات اور رسم ورواج کے ایسے متعدد مکمل "مذاہب" کی تکوین کا باعث بنا جن میں سے ہر ایک کو اسلام کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ حالانکہ ان میں سے ایک بھی بعینہ وہ اسلام نہ تھا جسکو نبی کریم صلعم نے اپنے مکہ کے وداعی خطبہ میں بطور امانت مسلمانوں کے سپرد فرمایا تھا۔ اس طرح قرآن کا یہ دین جس نے اپنے متبعین کو یہ تلقین کی تھی کہ "اللہ کی رسی کو باہم ملکر مضبوط پکڑے رہو"، اور ایک متحدہ زندگی بسر کرو خود اسکے ماننے کا دعویٰ کرنیوالوں کے ہاتھوں امت کے انتشار اور اسکی منقسم زندگی کا آلہ کار بن گیا۔

طرفہ یہ کہ اس دور میں جبکہ اولاً قرآن کی تشریح اور تفسیر کا آغاز ہوا، قرآن کے اس مقصد اور جوہر کا جو اسکے اندازِ بیان میں مضمر تھا، حقیقی ادراک نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ان ابتدائی تفاسیر میں بسا اوقات محکمات یعنی وہ آیات جنکا مفہوم صریح اور واضح ہے اور متشابہات وامثال یعنی وہ آیات جن میں تمثیل واستعارہ سے کام لیا گیا ہے، ہر دو میں کوئی خصوصی فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا حالانکہ قرآن اسکے

اپنے پڑھنے والوں کو ان ہر دو کے اندازِ بیان میں صحیح تمیز کی ہدایت کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان عربوں اور عجمیوں نے جو ابتداءً مشرف بہ اسلام ہوئے اور جن میں سے مفسرین بھی نکلے، قرآنی اعتقاد و عمل کے بنیادی اجزاء کو عرب و عجم کے مروجہ قبائلی اور جماعتی اعتقادات و رسوم و رواج کی روشنی میں دیکھنا شروع کیا اور قرآن کے مجازی و تمثیلی عنصر کی یا تو لغوی معنی کے اعتبار سے وضاحت کی یا اس طرح اس کی توجیہہ کی کہ وہ پیغام قرآنی کے حقیقی مفہوم اور اصل منشاء کے مغائر تھی۔ یہ اثر پذیری کچھ تو بلحاظِ نوعیت مشرکانہ ہے جو ان تشبیہی و تجسیمی اشارات میں نمایاں ہے جو ذاتِ باری اور اس کے صفات کے تصور کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور کچھ تو بلحاظِ اہمیت متصوفانہ ہے جو بڑی حد تک اشراقیت کی پیداوار ہے اور جو بطورِ خاص اس غیر عرب یا عجمی کوشش میں نمایاں ہے کہ قرآن میں جو کچھ درحقیقت صاف اور عام فہم ہے اس کو رازِ سربستہ اور علم لدُن سے تعبیر کیا جائے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ برتری اور شہنشاہیت کے احساس نے جو عربوں کے ذہنوں میں ان کی اپنی تیز رفتار فتوحات کی بدولت پیدا ہو چکا تھا، اس رجحان کو مزید تقویت دی کہ قرآن و حدیث کی ان عبارتوں کو جو عربوں کے اس زمانے کے خاص رسم و رواج یا نبی صلعم کی زندگی کے عارضی واقعات سے تعلق رکھتی ہیں، یہ اثر اور قوت دیجائے کہ وہ کلی اور عالمگیر حیثیت سے ہر زمانہ اور ہر حالت میں زندگی پر منطبق کیجا سکیں۔ اس لحاظ سے قرآنی لفظیات اور اس کے اسلوب بیان کے میدان تشریح و توضیح میں بھی علمی اور اصولی تحقیق کی آج اتنی ہی شدید ضرورت ہے جتنی کہ میدان روایات میں

پائی جاتی ہے اور اسی طرح ضرورت ہے کہ قرآن کے موقتی اور دوامی ہدایات میں بھی فرق کیا جائے۔

لیکن آج مسلمانوں کو اس خالص نتیجہ سے جو عہد ماضی کے متروکہ کی شکل میں جو کچھ اور جیسا کچھ بھی ان کو ملا، ہر حالت میں دوچار ہونا ہے۔ آج سے ہزار سال قبل غور وفکر کے جن خطوط کی داغ بیل ڈالی گئی تھی، ان ہی خطوط نے باوجود ان اصلاحی کوششوں کے جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے ذہن کو قرآنی قالب میں ڈھالنے کیلئے کی گئیں، مسلمانوں کے انداز فکر اور ان کی تاریخ کو بری طرح متاثر کردیا۔ مسلمانوں کے گھروں میں قرآن عام طور پر طوطے کی طرح پڑھا جاتا ہے۔ ہر ہفتہ مساجد میں قرآن کی توضیح وتشریح کیجاتی ہے۔ قرآن کی زبان کو روزانہ نماز میں دہرایا اور استعمال کیا جاتا ہے لیکن جو کچھ پڑھا اور دُہرایا جاتا ہے یا جس کی تشریح وتوضیح کیجاتی ہے اس کا مفہوم ہمیشہ قرآن کا اصلی مفہوم نہیں ہوتا بلکہ وہ مفہوم ہوتا ہے جو قرون وسطیٰ کے اموی وعباسی عہد میں ابتداءً قرآنی آیات کو دیا گیا۔ آج وہ مذہب جو مذہب اسلام کے نام سے موسوم ہے اور جو تمام اسلامی ممالک میں عوام اور حاکم طبقے کا مذہب ہے درحقیقت وہ قرون وسطیٰ کا اسلام ہے اور بعینہ وہ اسلام نہیں جو قرآن اور پیغمبر اسلام کا تھا۔ اس کا ظاہری ڈھانچہ گو آشفتہ حال ہی سہی، موجود ضرور ہے، لیکن اس کی روح بنیادی خصوصیات کے اعتبار سے غیر قرآنی ہے۔ ایسی صورت میں بجز ان مستثنیات کے جو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہیں اور جن کا وجود عظمت حیات اور لذت زندگی کا موجب ہے، اگر یہ کہا جائے تو کوئی حیرت اور تعجب کا مقام نہیں کہ عہد حاضر کے مسلمانوں کا ذہن قطعاً اس وضع کا

ذہن نہیں جس کی اُس غریب اَن پڑھ حبشی لڑکے نے حضرت عمرؓ کے عہد میں اپنے محدود دائرہ زندگی ہی میں سہی نمائندگی کرنے کی کوشش کی تھی۔

بلاشبہ مسلمانوں کے عہد وسطیٰ کی تاریخ بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس عہد میں ادب و فلسفہ اور علوم و فنون میں بیحد ترقی ہوئی۔ لیکن یہ ترقی مسلمانوں کی روزمرہ زندگی سے کوئی نامیاتی رابطہ نہیں رکھتی تھی۔ یہ ترقی بطور خاص اس عہد کے محدود علمی طبقہ سے متعلق تھی اور عوام کی روزمرہ سماجی اور مذہبی زندگی سے اس کا بہت کم تعلق تھا جن کو وہ عوام جہالت میں رکھا گیا تھا اور جو اس عہد کے ان تنگ نظر مذہبی پیشواؤں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے جن میں سے اکثر ان مستبد و خود مختار حکمرانوں کے وظیفہ خوار تھے جن کے سیاسی اغراض و مقاصد کی تائید و تکمیل ان کا فرض منصبی تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کا یہ ذہن بڑے ہی اطمینان کے ساتھ زندگی کے منازل طے کرتا رہا اور آج بھی اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے مقامی خصوصیات کو لئے ہوئے کارفرما ہے۔

یہاں میرا یہ مقصد نہیں کہ میں اس ذہن کے ارتقاء کی تاریخ بیان کروں اگرچہ میرے لئے سلسلہ بحث میں تاکید و توضیح کی خاطر کہیں کہیں اس کی نمایاں خصوصیات اور نشانات راہ کی طرف ایک سرسری اشارہ کرنا ضروری ہوگا۔ اسکے برخلاف میں قرآن اور نبی کریم صلعم کی زندگی کے صحیح اور غیر متنازع فیہ واقعات کی روشنی میں اپنی محدود دبساط کے مطابق ذہن انسانی کی ایک ایسی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرونگا جس کو انسان اپنے اغراض و مقاصد حیات کے پیش نظر ہر وقت اور

بالخصوص عہد حاضر میں اپنے لئے تشکیل دیسکے اور نہایت ہی اعتماد کے ساتھ ان اہم اور پیچیدہ مسائل کا مقابلہ کر سکے جن سے آج بنی نوع انسان دوچار ہیں۔ گو میرا خطاب بالخصوص ان حضرات سے ہے جو قرآن کے پیرو ہونے کے دعویدار ہیں لیکن درحقیقت میری یہ اپیل بحیثیت انسان کے فہم انسانی سے ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ دوسروں میں بھی امعان نفس کی کیفیت کو بیدار کر دیا جائے اس لئے کہ آج مسلمان جس مرض کا شکار ہو چکا ہے وہی مرض کسی نہ کسی صورت میں تمام بنی نوع انسان کو اپنی مضبوط گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ میں اپنے مضمون کی پیشکشی میں حتی الوسع فنی اصطلاحات کے استعمال سے احتراز کرونگا اور یہ محض اس لئے کہ قرآن نے خود اپنے انداز بیان میں کسی فنی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا ہے اور اس کا اسلوب ہی ایسا ہے کہ وہ اُس اَن پڑھ حبشی لڑکے کیلئے بھی جو بحیثیت ایک غلام کے بھیڑوں کے گلہ کی رکھوالی کر رہا ہے، قابل فہم ہے۔

-❖-

باب دوم
لنگر گاہ

قرآن مجید دراصل انسانی کردار و عمل کا ایک ضابطہ ہے۔ یہ وہ ادعا ہے جو خود اس کتابِ الٰہی میں موجود ہے۔ یہ ان لوگوں کیلئے چراغ ہدایت ہے جو ہدایت کے خواہاں ہیں۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ سورہ بقرہ آیۃ (۲) یہ مجرد اخلاقیات سے اس طرح مختلف ہے کہ ان لوگوں کیلئے جو اس کا اتباع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک مذہب کا حکم رکھتا ہے، اور اس کا میدان عمل زیادہ وسیع ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان لوگوں کیلئے یہ کوئی افادیت نہیں رکھتا، جو مذہب سے جھجکتے ہیں، اس لئے کہ اس ضابطہ کا پس منظر کتنا ہی وسیع اور عمیق مذہبیت کیوں نہ رکھتا ہو، جب اس کو روبہ عمل لایا جاتا ہے تو عقل ہی کے راہ سے لایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان اشخاص کیلئے بھی موضوع فکر بن سکتا ہے جو کسی ضابطہ مذہب پر ایقان تو نہیں رکھتے، لیکن فکر و عمل میں بے راہ روی کو ناپسند کرتے ہیں اور اپنے روزمرہ کاروبار کیلئے کوئی ایک معیارِ عمل ضروری سمجھتے ہیں۔ ان اشخاص کیلئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی نظامِ العمل کا مقصد ایسے ذہنِ انسانی کی تعمیر ہے جو اپنے آپ کے ساتھ امن و سلامتی سے رہ سکے اور خارجی دنیا سے بھی پرامن رابطہ پیدا کر سکے۔ اگرچہ کہ اس کا مطمحِ نظر بلند ہو کر مقصدِ حیات کی تکمیل کرنا ہے۔ عمل کی یہ وسیع تر تطبیق جو مجردِ عملِ اخلاق یا کسی

غیر مذہبی تصورِ حیات سے ماوراہے، اس قرآنی نظریہ پر مبنی ہے کہ موت زندگی کے اختتام کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک دروازہ ہے اُس عمل کی جولانگاہ کا جو تعمیرِ انسانیت کی ایک اور منزل کا پتہ دیتی ہے۔ یہی وہ جولانگاہ حیات ہے جس کے متعلق قرآن کا یہ قطعی وعدہ ہے۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ سورہ انشقاق۔ آیۃ (۱۹) یعنی تمکو ایک پست حالت سے برتر حالت کی طرف لے جایا جائیگا۔ قرآن کا یہ وعدہ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ لامتناہی امکانات کا ایک میدان کھول دیتا ہے۔ جس میں دوسری زندگی پہلی زندگی کا ثمر ہوتی ہے۔ اسی تسلسل حیات کے ابدی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر موجودہ زندگی کے انداز کا تعین کرنا ہے۔ چنانچہ قرآن جس ذہن کی تعمیر چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان دنیا اور عقبیٰ کو ایک تسلسل میں دیکھے اور اسے ایک عنصرِ واحد سمجھ کر اپنے اعمال و افعال کو اس کے مطابق بنائے چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۝ سورہ لقمان۔ آیۃ (۲۸) "تمہاری تخلیق اور تمہاری حیات بعد الموت ایک لمحہ کی طرح ہے۔"

اس ذہن کی تعمیر اور میدان حیات میں اس کا مظاہرہ جو قرآن کا کامل نصاب تہذیب ہے، ایک چھوٹے سے فقرے میں بند ہے۔ "آمنوا وعملوا الصالحات" (ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو)۔ جس ذہن کو قرآن پسند کرتا ہے اسکی تعمیر کی یہی ایک راہ ہے۔ اس طرح ایمان ایک ایسی قوت بن جاتا ہے جو ذہن انسانی کو رنگ دیتا اور اس میں ایک کیفیت عمل پیدا کرتا ہے اور جو عمل اس کے مطابق ہوتا ہے وہ گویا ایمان ہی کا ایک متحرک عکس ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ آخر ذہن انسانی کو پالنے والے وہ کونسے امور یا عقائد ہیں جو عمل صالح کی رہبری کے سرچشمے قرار دئے جا سکتے ہیں۔

فی الحقیقت اس کی ضرورت بھی ہے، کیونکہ ذہن کی قوتِ عمل کے تجزیہ کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسکی اساس کی نوعیت کیا ہے، اسکے جملہ اجزائے ترکیبی کیا ہیں، یا وہ قوی اور عناصر کیا ہیں، جن سے اسکی تعمیر ہوتی ہے۔ الغرض ان تمام خصوصیات کو جو اس کے لئے ایک لنگر گاہ کا کام دیتے ہیں جس سے انسان کو دور نہ ہونا چاہیے۔

توحید باری

قرآن ذہن انسانی کو جس بنیادی تصور کی طرف متحرک کرنا چاہتا ہے وہ توحید باری کا تصور ہے۔ یہ وہ تصور ہے جسکی بنیاد پر ایک اور تصور یعنی وحدتِ انسانی کو قائم کرنا اور اس سے حیات کا انتساب کرنا ہے۔ "لا الہ الا اللہ" خدا کے سوائے کوئی لائق پرستش نہیں۔ یہ وہ تصور ہے جس پر قرآن نے اتنا زور دیا ہے کہ گویا قرآن اسی ایک تصور کے مضمرات کی تشریح ہے۔ اس سے متعلق مشہور پادری سی۔ ایف اینڈ روز آنجہانی (Rev. C. F. Andrews) اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں:۔

> "تاریخ انسانی کے ایک نازک دور میں اسلام نے توحید الٰہی کے تصور شدت کے ساتھ جو زور دیا، در حقیقت وہ ایک عظیم ترین نعمت تھی، جو اس نے مشرق و مغرب کو یکساں طور پر عطا کیا۔ اس عہد تاریک میں ۶۰۰ء اور ۱۰۰۰ء کے دوران، ہندو مذہب اور عیسائیت میں ان گنت دیوتاؤں اور مذہبی پیشواؤں کی پرستش کی وجہ سے

یہ تصور توحید الہٰی اس قدر زنگ آلود ہو چکا تھا کہ وہ بالکل گم ہو جانے کے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ توحید باری کی صداقت جلیلہ سے ہٹ جانے کی تاریک ترین ساعتوں میں یورپ اور ہندوستان کیلئے دین اسلام ایک زبردست روک اور تصحیح کرنے والی قوت ثابت ہوا۔ اپنے مرکزی مقام سے ہندوستان اور یورپ کی ہر دو جانب رُخ کرکے اگر اسلام اس حقیقت بالغہ پر آخری مہر نہ کرتا تو خدا کی وحدانیت کا یہ تصور فکر انسانی میں وہ مستحکم مقام حاصل نہ کرتا جو آج کی عقلی اور شعوری دنیا میں اسے حاصل ہے۔"

اُس زمانے میں جبکہ آنحضرت صلعم صغر سنی سے شباب اور شباب بالغ نگاہی کی منزلیں طے فرما رہے تھے، اگر ہم فکر اور حیات انسانی کے دریا کا انداز دیکھیں تو آپکی وہ صدائے باطن جو کلمہ توحید کی صورت میں رُونما ہوئی اور حقیقت انسانیت کی وہ صدائے محکم معلوم ہوتی ہے جو بلند ہونے اور اپنے آپ کو منوانے کے لئے بے قرار تھی یہی وجہ تھی کہ وہ آنحضرت کی زندگی ہی میں نہ صرف حدود عرب ہی میں بلکہ اس کی سرحدوں کے پار بھی سنی گئی۔ توحید کے روحانی مضمرات کی طرف اس مقالے کے بعد کی منزلوں میں اشارہ کیا جائے گا۔ فی الحال اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی افادیت کے مدنظر یہ تصور بڑا کارگر ثابت ہوا۔ اس تصور نے کہ "خدائے تعالےٰ کے سوائے کوئی لائق پرستش نہیں ہے"، رنگ و نسل کے سارے امتیازات دھو دئے، اور زندگی کے تمام امتیازی و درجہ واری سیاسی اور

معاشرتی تصورات کو مٹا دیا۔ یہ وہ نعرۂ انقلاب تھا جس میں انسانی نجات مضمر تھی۔ اس نے خدا کے بعد انسان کو سب سے بڑا درجہ دیا اور ان کے درمیان صرف عمل صالح و تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیکر انسان میں عظمت انسانی کے احساس کو دوبارہ زندہ کیا۔

اتحاد انسانی

انسان میں عظمت انسانی کا احساس بڑھانے کے ساتھ ساتھ قرآن اسے یہ بھی سمجھنے کی ہدایت کرتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۝ (سورۃ یونس۔ آیۃ (۲۵)) جملہ انسان پہلے ایک ہی امت تھے، اور بعد میں وہ منقسم ہوئے۔ اس لئے انسان کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس اتحاد کو پھر سے قائم کرے۔

اتحاد انسانی کو قائم رکھنے کے مسئلہ پر قرآن اس درجہ زور دیتا ہے کہ پیغمبر خدا نے تمام بنی نوع انسان کو "عیال اللہ" سے تعبیر فرمایا ہے۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ ۝۱	ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اسی سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا ہے۔
التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی عیال اللہ ۝۲	سنت اللہ کی تعظیم کرو اور عیال اللہ سے محبت رکھو۔

قرآنی ہدایت یہ ہے کہ:—

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ سورۃ المائدۃ۔ آیۃ (۳۲)

جو شخص کسی شخص کو بغیر زمین میں فساد پھیلانے کے مار ڈالے تو گویا اس نے تمام عالم انسان کو مار ڈالا اور جو شخص کو بچالے۔ اس نے گویا تمام انسانوں کو بچالیا۔

آج سے تیرہ سو سال قبل قرآن نے جس تصور پر اس قدر زور دیا تھا کہ بنی نوع انسان ایک ہی نوع تخلیق ہے، اور اختلافات نسل کا نظریہ ایک سماجی افسانہ ہے جس سے شیرازہ انسانی بکھر گیا، وہ آج کی دنیا میں ایک سائنٹیفک حقیقت کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ یونیسکو (Unesco) کی ایک مستند رپورٹ جو نسل انسانی سے متعلق ہے اور جو جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی پڑھنے کے لائق ہے۔ یونیسکو نے ماہرین سائنس کی ایک بین الاقوامی مجلس بنائی تھی تاکہ نسل کے متعلق جدید تحقیقات کیجائے، اور وہ فیصلے جمع کئے جائیں جنہیں دنیا کے ماہرین حیاتیات، نسلیات، نفسیات، سماجیات اور انسانیات نے اصولی حقائق کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ان ماہرین کے بیان کا متن ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے جو قرآن کے مندرجہ صدر اعلان کی یاد دلاتے ہیں۔

سائنس دانوں نے متفقہ طور پر یہ نظریہ تسلیم کرلیا ہے کہ عالم انسانی ایک وحدت ہے اور جملہ انسان ایک ہی نوع سے ہیں۔ یہ رپورٹ جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ اس حدیث نبوی کے اخلاقی مضمرات کی

وضاحت کرتی ہے کہ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ
"تم میں سے ہر ایک دوسرے کا گلہ بان ہے اور اپنے اپنے گلہ کی حفاظت کے متعلق جوابدہ ہوگا"

سائنس دانوں کی تحقیقات کا نتیجہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

"حیاتیاتی مطالعہ سے عالمگیر انسانی برادری کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ انسان تعاون کے رجحانات لیکر پیدا ہوا ہے، اور جبتک یہ رجحانات پورے نہیں ہوتے، انسان اور اقوام دونوں سماجی حیثیت سے بیمار ہوجاتے ہیں۔ انسان فطرۃً مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اور وہ اپنی منزل تکمیل تک اسی وقت پہنچ سکتا ہے جبکہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ربط کامل قائم کرے۔ کسی نقطے پر بھی اگر اس مدنی رشتے سے انکار ہو تو، اس کا نتیجہ انتشار ہوگا۔ ان معنوں میں ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالی ہے کیونکہ ہر انسان وحدتِ کامل کا ایک جزو ہے اور اصل کی ایک نوع ہے اس لئے کہ وہ انسانوں کے زمرے میں ہے"

توحید باری کی اساس پر اتحاد انسانی کا قائم ہونا معاشرتی نکتہ نظر سے قرآن کا سب سے زیادہ اہم موضوع بیان ہے۔ اس اتحاد کو قائم رکھنے کیلئے قرآن نے اولاً احساس رواداری پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ آنحضرت صلعم کے زمانے میں دیگر تنازعات کے مقابلہ میں سب سے بڑی نزاع مذہبی میدان میں تھی۔ قرآن سب سے پہلے اس نزاع کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ سامی منطقے میں

اس وقت جو مذاہب رائج تھے، وہ عیسائیت اور یہودیت تھے۔ قرآن کا منشاء یہ تھا کہ رسول اللہ صلعم ان دونوں مذاہب کے پیروؤں سے خوش آیند راہ و رسم کی کوئی صورت نکال لیں۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ سورۃ آل عمران آیۃ (۶۲)

(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک بات پر (متفق ہو جائیں) جو تمہارے ہمارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کا کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب قرار دیں۔

تعاون کی شرط صرف اتنی تھی کہ توحید الٰہی پر اتفاق رہے۔ اس قسم کے تعلقات قائم رکھنے کی رعایت صرف یہود و نصاریٰ ہی تک محدود نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کیلئے بھی اس میں وسعت موجود ہے بشرطیکہ توحید الٰہی کی اساسی شرط کی تکمیل ہو سکے۔ قرآن بار بار اس کا اعلان کیا ہے کہ سارے مذاہب کی اساس توحید ہے اس لئے انہیں چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کے حریف بنکر کام نہ کریں، بلکہ عالمی اتحاد کیلئے متحد و متفق رہیں۔

رسول خدا کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:—

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

تمہارے لئے اس نے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کا

وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۝ سورۃ شوریٰ آیۃ (۱۳)

حکم ہم نے تم کو دیا ہے اور جسکا حکم ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا (وہ یہ ہے) کہ تم دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ سورۃ فاطر۔ آیۃ (۲۴)

ہم نے تم کو حق و صداقت کیساتھ خوشخبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں جسمیں اللہ کی نافرمانی سے ڈرانیوالا نہ گزرا ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۝ سورۃ المومن آیۃ (۷۸)

ہم نے بلاشبہ کئی رسول تم سے پہلے بھیجے ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر کیا ہے اور بعض وہ ہیں جنکا ہم نے تم سے ذکر نہیں کیا۔

آخر میں قرآن اجمالاً یہ تلقین کرتا ہے :۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

سورۃ آل عمران۔ آیۃ (۸۳)

اے مسلمانوں کہدو۔ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو کچھ ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو کچھ ابراہیمؑ اسماعیلؑ اسحاق و یعقوبؑ اور انکی اولاد کی طرف بھیجا گیا۔ اور اس پر جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو انکے پروردگار کیطرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔

وَ إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ؕ سورۃ مومنون۔ آیۃ (۵۲) — اے پیغمبرو تم سب ایک ہی جماعت ہو۔

اس قسم کی وسیع القلبی پیدا کرتے ہوئے قرآن نے ایک احتیاط یہ بھی کی ہے کہ عربوں میں یہ احساس پیدا ہونے نہ پائے کہ عربی زبان ہی جس میں قرآنی پیام نازل ہوا خاص خدا کی زبان ہے۔ خدا اپنا پیام ہر زبان میں سناتا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ سورہ ابراہیم آیۃ (۴) — اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی پیغمبر مگر اس کی اپنی قوم ہی کی زبان میں تا کہ وہ انہیں (پیام ربانی) وضاحت کے ساتھ بیان کرے۔

ذہن انسانی میں اس وسیع المشربی کو پیدا کرنے کا رجحان اتنا وسیع ہے کہ قرآن صرف اہل قرآن ہی کی نجات کا وعدہ نہیں کرتا بلکہ ان لوگوں سے بھی وعدہ کرتا ہے جنہیں دیگر صحائف آسمانی عطا ہوئے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کی بھی نجات کا وعدہ کرتا ہے جو کسی خاص منضبط مذہب کا پیرو تو نہیں لیکن کسی نہ کسی طرح توحید باری کا قائل ہے اور ساتھ ہی اپنے اعمال کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا اور نیک زندگی بسر کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ — بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے (اس پر اے محمد جو ہم نے تجھ پر نازل کیا) اور وہ جو یہود نصاریٰ اور صابئین ہیں جو شخص اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لائے اور جو نیک کام

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ سورۃ البقرہ - آیۃ (۶۲) — کرے پس انکے لئے پروردگار کے پاس صلہ ملے گا۔ اور انکے لئے کوئی خوف اور اندیشہ نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ سورۃ الاحقاف - آیۃ (۱۳، ۱۴) — بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے یہی لوگ جنت والے ہیں یہاں وہ ہمیشہ رہینگے ان اعمال کے صلے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔

اس وسیع المشربی کا مقصد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان کوئی آویزش نہ ہو، اور توحید باری کے ایقان مشترک کو باہمی تعلقات کی اساس قرار دیا جائے جس سے شعوری طور پر جذبۂ وحدتِ انسانی حرکت میں آئے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۝ سورۃ الحجرات۔ آیۃ (۱۳) — اے لوگو بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قبیلے اور خاندان بنایا۔ تاکہ تم باہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے وہی زیادہ شریف اور عزت والا ہے جو تم میں سے زیادہ برائیوں سے بچنے والا ہے۔

آیت پاک کے اس جزو پر غور کریں "ایک دوسرے کا خیال رکھیں"
"رسول اکرم کے منصوبے کے مطابق یہی وہ مقام اشتراک تھا جس پر سارے انسان جمع ہو کر عیال اللہ کی شکل اختیار کریں۔ یہی ایک طریقہ تھا جس پر انسانی برادری قائم ہو سکتی تھی جس عالمی تنظیم پر رسول اکرم نے اپنا دل جمایا تھا وہ صرف پیروان قرآن ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اس میں وہ سب داخل ہو سکتے تھے جو توحید باری پر ایقان رکھتے ہوں اور اسکے مطابق ان کا عمل بھی صالح ہو۔

آنحضرت صلعم نے اس اقل ترین شرط یعنے ایقان توحید باری جس سے عمل صالح رونما ہوتا ہے اس لئے بہت زیادہ زور دیا تھا کہ توحید الٰہی کا احساس تعلقات زندگی میں احساس وحدت انسان کا روپ اختیار کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی اصطلاح میں "کفر" کے لفظ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ غیر مسلم حلقوں میں یہ لفظ اس وجہ سے ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے مفسرین نے چونکہ اس کے حقیقی مفہوم پر زور نہیں دیا تھا بناء بریں غیر محتاط طریقے پر یہ لفظ جوش تعبیر میں نہ صرف غیر مسلموں کیلئے بلکہ ان مسلمانوں کیلئے بھی استعمال کیا جانے لگا جو کسی نہ کسی وجہ سے ایک دوسرے سے سرمو اختلاف کرتے تھے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار قرآن تو نہیں ہے۔ دراصل کافر سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے فکر و عمل میں توحید کے مضمرات سے بے پروا ہو جاتا ہے اور اس طرح انسانوں کے درمیان نفاق پھیلانے کا موجب ہو جاتا ہے۔ یہ قرآنی مفہوم کے مطابق توحید سے عملی انکار ہے۔ اس لئے قرآن کفر سے کوئی مصالحت کرنے تیار نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ کفر یعنی ایسی قوت جو نفاق پیدا کرے، ہر اس

منصوبے سے جس کا مقصد اتحاد پیدا کرنا ہے، نہ میل کھیگی اور نہ اس سے تعاون کرسکیگی۔ اس تصوراتی اختلاف کے سوا جو کفر کی ہر شکل سے رہیگا، دیگر مذاہب کے ساتھ قرآن کا اساسی سلوک یا تو ایک خوش آئند معاملاتی سمجھوتہ کا حامل ہے جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا، یا ایک خاموش رواداری اور تحمل کا حامل ہے۔ اور یہ اس امید اور اعتبار پر اختیار کیا جائے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ ان سب کو ملا دیگا اور اس طرح منشاء توحید ایزدی اتحاد انسانی کی صورت میں پورا ہوگا۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۔ سورۃ الشوریٰ۔ آیۃ (۱۵)

پس (اے محمد) انکو اسی طرف بلاتے رہو جس طرح تم کو حکم ہوا ہے اسی پر قائم رہو اور ان کے طریقوں کی اتباع نہ کرو اور کہدو کہ اللہ نے جو بھی کتاب نازل فرمائی میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا رب ہے، ہم کو ہمارے اعمال کا معاوضہ ملیگا اور تم کو تمہارے اعمال کا۔ اور ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی تکرار نہ رہے۔ اللہ ہم سب کو ملائیگا اور ہم سب کو تو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

الغرض اتحاد انسانی ان اہم مقاصد میں سے ہے جسے عمل صالح کے ذریعہ انسان کو حاصل کرنا ہے لیا عمل جو تصور توحید باری سے مطابقت رکھتا ہے اور انسان کے مقصد زندگی کا تعین کرتا ہے

منصب انسانی

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کے پیام اولین ۔ لا الٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں ۔ سے نظم تخلیق میں انسان کا مقام متعین ہوتا ہے۔ یہ انسان کا درجہ کسی دوسری مخلوق کے مقابلے میں کمتر مقام پر لا نہیں ڈالتا۔ بلکہ یزدانی اقدار کی میزان میں اس کا درجہ آفتاب، مہتاب اور دیگر اجرام فلکی سے جن کی پرستش دور سے کی جاتی ہے یا زمین کی کسی شئی سے جسکو قریب سے پوجا جاتا ہے کسی طرح کم نہیں، اور نہ فطرت کی اُن غیر مرئی قوتوں کے گروہ سے جنہیں ملائکہ کہتے ہیں کسی طرح پست ہے۔

قرآن نے اعلان کیا ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین انداز پر ہوئی ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم۔ یہ وہ ہے جس کے آگے ملائکہ نے تعظیم سے سر جھکایا اور جس کے لئے کہا گیا کہ "مسخر کر دئے ہم نے تمہارے لئے جو کچھ زمین آسمان میں ہے"۔

اس طرح میزان تخلیق میں اس کا مرتبہ بلند کر کے اور خدا کے بعد اس کا درجہ متعین کر کے، اس کو زمین پر نائب خدا کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا جو موقع دیا گیا ہے اس سے اسکی اہمیت میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ اس حقیقت کا انکشاف جس تشبیہی پیرائے میں کیا گیا ہے اس سے انگریز شاعر میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) کے مشہور اشعار موسوم بہ انقلابات (Revolutions)

کی یاد آتی ہے۔

"اس سے قبل کہ انسان عالمِ خاکی کیطرف روانہ ہوا، اور جبکہ وہ ہنوز سرحدِ آسمانی پر کھڑا ہوا تھا خدا نے اس کے ہاتھوں میں حروف کا ایک انبار ڈالدیا اور حکم دیا کہ اس سے جو لفظ چاہے بنالے۔

انسان نے اسے کئی مرتبہ الٹا، پلٹا۔ بنایا یونان، روما، انگلستان، فرانس۔ ہاں یہ کوشش رائیگاں نہ ہوئی۔ نئی نئی راہیں نکل آئیں۔ تجربے ہوتے رہے۔ حروف ملتے رہے، کچھ نہ کچھ بنتا رہا۔
مگر شاعر اپنی دردبھری آواز میں کہتا ہے کہ:۔
آہ! ایک فزوں نہ ہونے والا احساس اسے ستا رہا ہے کہ وہ جو (لفظ) بنانا تھا نہ بنا سکا۔ اگرچہ کہ وہ بوڑھا ہوچکا اس کی یہ تمنا ہے کہ از سرِ نو کوشش کرے، اسلئے کہ اسے اس لفظ کا پتہ نہیں لگا جیسے خدا چاہتا تھا۔

اپنے عہدِ عروج کو پہنچ کر سلطنتوں کی سلطنتیں اسی احساس گراں کو محسوس کرتی رہیں، یہ محسوس کیا کہ ان کے عظیم ڈھانچے صحیح تعمیر نہ ہوسکے، اس لئے وہ زوال پذیر ہوئے اور اپنے ہی تخت پر سسکتے سسکتے ختم ہوگئے۔

یہ تھا شاعر کا خیال جو بدیہی طور پر سینٹ جان St. John کے اس

فقرے کا زمین منت ہے کہ "وہ پہلے لفظ تھا" اور لفظ خدا کے ساتھ تھا" اور لفظ خدا تھا"
اس تصور کے تحت انسان کا مقصد یہ قرار پایا کہ اس لفظ کو دریافت کرے۔ برعکس
اس کے قرآن ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے۔ قرآن یہ اشارہ نہیں کرتا کہ خدا نے
حروف کا ایک انبار انسان کے ہاتھ میں اس وقت ڈالدیا جبکہ وہ عالم خاکی کی
طرف آرہا تھا، اور اسے حکم دیا کہ جو لفظ چاہے بنالے۔ اس کے برخلاف وہ یہ
اعلان کرتا ہے کہ نہ صرف وہ لفظ انسان کو بتادیا گیا اور اس کا مفہوم اسے سمجھادیا
گیا بلکہ اس خیال سے کہ کہیں وہ اسے بھول نہ جائے اسکے اجزائے ترکیبی بھی اسکے خمیر اور
ضمیر سے پیوست کردئے گئے اور اسے حکم دیا گیا کہ اس امانت کی حفاظت کرے،
اسکے حروف سے نہ کھیلے، اسکی ترتیب کو ہاتھ نہ لگائے، تاکہ ایک طرف وہ اپنے نفس کیساتھ
امن و سلامتی سے رہ سکے اور دوسری طرف خارجی دنیا کیساتھ بھی امن و سلامتی سے زندگی بسر کرسکے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي	اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں
جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا	عنقریب اپنا نائب (خلیفہ) بھیجنے والا ہوں تو
أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا	انہوں نے کہا کہ کیا تو اس (زمین) پر ایسے کو نائب
وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ	بنانا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی برپا
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ	کریگا درآنحالیکہ ہم تیری تعریف کیساتھ تسبیح و
إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝	تقدیس کرتے رہتے ہیں۔ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے)
وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا	بیشک میں جانتا ہوں ان باتوں کو جنکو تم نہیں
ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ	جانتے۔ اور اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آدم کو

فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

سورۃ البقرہ۔ آیۃ (۲۸ تا ۳۱)

سالے (چیزوں کے) نام سکھائے اور پھر انکو فرشتوں کے سامنے رکھا اور فرمایا کہ اگر تمہارا کہنا صحیح ہے تو مجھے انکے نام بتاؤ۔ انہوں نے (فرشتوں نے) کہا تو پاک اور برتر ہے ہمکو جو کچھ تو نے سکھلایا ہو اسکے سوا ہمیں کسی اور چیز کا علم نہیں بیشک تو بڑا ہی جاننے والا ہے اور حکمت والا ہے۔ (تب) اس نے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ آدم تم انکو ان چیزوں کے نام بتاؤ اور جب انہوں نے انکو (فرشتوں کو) انکے نام بتلائے تو فرمایا (اللہ تعالیٰ) کیوں! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں جنکو تم نہیں جانتے۔

اس طرح جب اس میں منشاء تخلیق اور اسماء یعنی اشیاء کا مفہوم پایا تو اسکے اندر حیات کا شعور پیدا ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسان وحدت حیات کی توثیق کر دے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

اور جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشت سے انکی اولاد نکالی اور ان سے خود انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۚ تو انہوں نے جواب دیا کیوں نہیں ہم سب اس کے
شَهِدْنَا ۚ سورۃ الاعراف آیۃ (۱۷۲) گواہ ہیں۔

اس طرح لیس ہو کر فطرت انسانی نے بار امانت یعنی بار خلافت اُٹھانے
کیلئے خود کو آمادہ پایا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۝

بیشک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا لیکن ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

سورۃ الاحزاب۔ آیۃ (۷۲)

(بار امانت اُٹھانے کا) یہ عمل بظاہر کوئی آسان کام نہ تھا۔ خود قرآن بھی اس جرأت رندانہ پر متحیر ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے سلسلے ہی میں ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ بیشک وہ (انسان) اپنے اوپر بڑی سختی کرنیوالا اور کسقدر سادہ لوح ہے۔

لیکن منشاء یہی تھا کہ وہ اس بارِ امانت کو اٹھائے تاکہ اسی کی تکمیل کیلئے اس کو ایک حالت سے دوسری بہتر حالت کی طرف لیجائے۔

یہ طریقۂ عمل الٰہی نظام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ارتقائے تخلیق سے متعلق ہے اور جس پر آئندہ چل کر ہم تفصیلی روشنی ڈالینگے لیکن اس آزمائش میں جو صعوبت ہے اسے ہلکا کرنے، اور بارِ امانت اُٹھانے میں اس کی

مدد کرنے، یا اسے دی جانیوالی زندگی کی حفاظت کرنے، یا اسے بتائے ہوئے اسم یا لفظ کے حروف کو مرتب رکھنے کیلئے، اس کی فطرت میں ایک توازن کا احساس پیدا کر دیا گیا، اور اس سے یہ کہا گیا کہ جس طریقے سے وہ اس سے کام لیگا اسی انداز سے وہ اس کا صلہ پائیگا۔ اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ہ

سورۃ الشوریٰ۔ آیۃ (۱۶) "اللہ ہی تو ہے جس نے کتاب اتاری حق اور میزان کے ساتھ"

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ سورۃ والشمس۔ آیۃ ۷ تا ۱۰)

قسم ہے جان کی اور اسکی جس نے اسکو درست اور ٹھیک بنایا اور پھر اسکو برائی اور پرہیزگاری میں تمیز کرنے کی صلاحیت بخشی۔ پس کامران ہے وہ جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا۔ اور نا کام ہے وہ جس نے اس کو گندہ کر دیا۔

اسی آیت میں جو حقیقت رکھی گئی ہے اسے قرآن نے ذو معنی طریقے پر بیان کیا ہے جو دونوں طرح بھی صحیح ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ سورۃ والتین۔ آیۃ (۴ و ۵)

بیشک ہم نے انسان کو بہترین انداز میں پیدا کیا اور پھر پھیر دیا ہم نے اسکو نیچے والوں سے بھی نیچے۔

فطرت انسانی کے اس تضاد کو ہر عہد کے ہر مفکر کو تسلیم کرنا پڑا۔ ہر مذہب کا یہ کام ہے کہ وہ انسان کو سطح حیات سے نیچے اترنے سے روکے۔ اس ذو معنی

مفہوم کی وضاحت کے سلسلہ میں خود قرآن کہتا ہے کہ

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ	پھر ہم نے کر دیا نیچے والوں سے بھی نیچے بجز ان کے
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے
الصّٰلِحٰتِ ۞ (سورۃ والتین ۔ آیۃ ۵ و ۶)	

بعض لوگ ایمان و اعتقاد کو نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بتاتے ہیں، لیکن اسلام میں اعتقاد محض کافی نہیں اس کے مناسب عمل صالح بھی ضروری ہے اسکی اچھائیوں اور نیکیوں کے برقرار رکھنے، اور زمین پر نائب خدا کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں اسکی دستگیری کرنے کا یہی اسلوب ہے۔ یہ نیابت کلیسا اور یا بادشاہوں کا وہ "ظل الہٰی" اقتدار نہیں ہے۔ جس سے بندگانِ خدا پر من مانی حکومت کیجائے۔ اس کی بجائے یہ خود بنی نوع انسانی کا جبلی حق ہے کہ وہ اپنی زندگی کو تنظیم اور ہم آہنگی کے اس اصول کے مطابق منضبط کرے جو تخلیق بزدانی میں نظر آتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ	پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ سیدھے اس دین یا
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	راستہ کی طرف رکھو جو اللہ ہی کا راستہ ہے اور
عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ	جس پر انسان کو فطرتاً ڈھالا گیا ہے۔ اللہ کے
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ	راستہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی سیدھا
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞	دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

سورۃ الروم ۔ آیۃ (۳۰)

وہی لوگ صحیح معنوں میں زمین پر خدا کے نائب کہلائے جا سکتے ہیں جو خدا کی

بنائی ہوئی راہ پر سر جھکاتے اور پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا فریضۂ حیات نہ صرف اپنے، بلکہ تمام ہم جنسوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہے جو نبی کریم صلعم کے الفاظ میں باہم مل جل کر "عیال اللہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جن میں کا ہر فرد اپنی زندگی اپنے خالق سے حاصل کرتا ہے اور جس کی ہی طرف وہ لوٹینگے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ	نہیں ہے زمین پر چلنے والا کوئی ایسا جانور
وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ	اور نہیں ہے اپنے دو بازوؤں پر اڑنے والا
اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا	کوئی ایسا پرند، مگر یہ کہ انکی بھی تمہاری
فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى	طرح جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں کسی چیز
رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ سورة انعام	کو نہیں چھوڑا ہے۔ پھر سب اپنے رب کی طرف جمع کئے جائینگے۔

آیۃ (۳۸)

آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نائب خدا کی حیثیت سے انسان کا منصب حیات صرف یہی نہیں ہوگا کہ وہ اپنے آپ کے ساتھ امن و سلامتی سے رہے اور خارجی دنیا کے ساتھ رابطہ امن قائم رکھے، بلکہ اپنی زندگی کو اس طرح سنوارے کہ اس سے حیاتِ مابعد کی مقتضیات بھی کما حقہٗ پوری ہو سکیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ وہ صورت ہے جو قرآن ہر ایک کے سامنے لاتا ہے۔ اور یاد دلاتا ہے کہ ہر مرد اور عورت کو اپنے اپنے اعمال کا حساب جو انہوں نے اپنی موجودہ زندگی میں کئے ہیں خدا ہی کے آگے دینا ہوگا۔ اس لئے اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کا نظریہ انسان کے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا

ہے جتنا کہ توحید الٰہی کا وہ تصوّر جو عمل صالح کے نظام العمل کے ذریعہ وحدتِ انسانی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

باب سوم

تیاری

یہ کام کس طرح انجام دیا جائے ؟ اس کا جواب ایک لفظ "اسلام" یا سنت اللہ کی پابندی میں مضمر ہے۔ جس کے لئے قرآن کے بیان کے مطابق انسان فطرتاً خلق کیا گیا ہے۔

اس اصطلاح کی تشریح جس کی روح جملہ مذاہبِ عالم میں موجود ہے۔ ڈاکٹر جی، ایچ، برجس نے (Dr. J.H. Bridges) جو ایک ایجابی مفکر اور کانٹ (Cante) کے پیرو ہیں اپنی اس تقریر میں کی ہے جو ۱۸۷۹ء میں کی گئی تھی۔

"مسلمان کا ایمان صرف ایک لفظ "اسلام" یعنی اطاعت، یا اپنی مرضی کو خدا کے فیصلہ عظیم کے سپرد کر دینے میں مضمر ہے۔ یہ لفظ محمد صلعم نے صرف اپنے متبعین کی حد تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ بلا تعصب اسے پیشرو یہود و نصاریٰ کیلئے بھی استعمال کیا۔ بنی نوع انسان کے مذہب کیلئے اس سے زیادہ مناسب کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں ہے۔ مغربی زبانوں میں اگر کوئی لفظ اس کا صحیح مفہوم ادا کر سکتا ہے تو وہ خود لفظ "ریلجن" (Religion) ہے۔ اُن کانوں کیلئے جنکی تربیت لاطینی بولی کے لئے نہیں ہوئی ہے، اسکی تشریح ضروری ہے۔ پیروانِ اسلام کیطرح

ہمارے لئے بھی یہ لفظ زندگی کے دو عظیم اور ناقابل تقسیم پہلوؤں کو پیش کرتا ہے، ایک عبادت، دوسرے عمل۔ "عبادت کرو، اور خیرات کرو" آنحضرت صلعم فرماتے تھے:۔ ان کے عہد کی سادہ ضروریات کے مدِّنظر خیرات کا مفہوم جو قابل تحسین دانشمندی کے ساتھ قائم ہوا، اپنے معنوں میں اس قدر وسیع ہے کہ ہر قسم کے خیر اور نیکی کے میدان پر حاوی ہے۔ قرون وسطیٰ کی اس بزرگ ہستی نے کہا تھا۔ "عبادت کرو کہ جیسے عمل سے کچھ حاصل نہیں۔ اور عمل اس طرح کرو کہ جیسے عبادت کا ماحاصل کچھ بھی نہیں۔ ہر عہد اور ہر قوم کے روحانی پیشواؤں نے یہی بات مختلف طریقوں اور زبان اور تمثیلی اشاروں میں کی تھی۔ میں نے اسے کنفیوشیس (Confucius) کی تعلیم میں دیکھا جو ایسے مذہب کا بانی ہے جس پر چینی قوم ۲۵ صدیوں سے متحد ہے۔ یہی ہندوستان کی قدیم تعلیمات میں پایا ہوں۔ جیسے جیسے علم جدید کو ان کے اسرار کا انکشاف ہو رہا ہے مصری قدیم یادگاروں میں بھی یہ موجود ہے۔ میں اسے حکیم فیثا غورث (Pythagoras) کی مساعی میں بھی پاتا ہوں جس نے ناپختہ کار ہی سہی لیکن انسانی اساس پر حیات کو منظم کرنے میں نہایت بار آور نتائج پیدا کئے۔ آخر میں میں اسے عبرانی اور عیسائی انجیلوں میں بھی دیکھتا ہوں۔ جن کا ادعا یہ ہے کہ ایسی تعلیم صرف انہیں کا

اجارہ ہے۔

اس طرح اسلام یا انگریزی زبان میں "اطاعت" یعنی زندگی کو رفیع ترین مقاصد کے سپرد کر دینا اپنے ارادے کو مشیت ایزدی کے مطابق بنا دینا۔ یہ وہ لفظ ہے جو ہر عہد اور ہر ملک کے نیک انسانوں کی زندگی کا اجمال ہے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک نصب العین، ایک مثال، ایک نقشہ بنا لیا اور تا حدِ امکان یہ کوشش کی کہ یہ نصب العین ایک حقیقت بن جائے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے عبادت بھی کی اور عمل بھی کیا۔" ؎

اب سوال یہ ہے کہ اپنی مرضی کو قادر مطلق کی مرضی کے مطابق کس طرح بنایا جائے؟ اس کام کے لئے دو پہلو ہیں۔ اولاً ایمان و ایقان۔ ثانیاً اس کے مطابق عمل۔ "عبادت کرو اور کام کرو" صرف یہی انسان کا وظیفہ حیات نہیں ہے بلکہ قرآنی حکم یہ ہے کہ:۔ "ایمان لاؤ اور عمل صالح کرو"۔ اسلام میں "عبادت" زیادہ تر روح کا ایک عمل ہے اور "عمل" کا لفظ اس پر حاوی ہے۔ قرآن اس امر پر زور دیتا ہے کہ ایقان محض کافی نہیں اور یقیناً مناسب عمل کے بغیر ایقان محض ایک جمودی کیفیت ہے۔ ذات باری کا فلسفیانہ ادراک یا مراقبہ بے نتیجہ ہے اگر وہ صفات الٰہی کے مطابق زندگی میں حرکت عمل پیدا نہ کریں۔ اسی طرح وہ روحانی مشق جو بعض حلقوں میں بطور وظیفہ کی جاتی ہے' یا روحانی کمالات کا عمل خواہ وہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، ایک نفسیاتی ورزش سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں رکھتا

اگر وہ انسان کے لئے ایک متحرک اخلاقی زندگی حاصل نہ کرے۔ پھر یہ متحرک اخلاقیت اس شخص کے لئے بھی ناممکن ہے جو کسی خانقاہ یا غار میں گوشہ نشین ہو کر اپنی انفرادی نجات کا خواہاں ہے، یا جو جسمانی ضروریات کو نظر انداز کر کے یہ سمجھتا ہے کہ اس کا فرض اپنی روح کی پرورش ہے۔ ایسے اشخاص کے لئے نیابت الٰہی کسی حال میں بھی ممکن نہیں۔ اس کے بجائے یہ اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے اندر یزدانی صفات پیدا کرتا ہے اور ارادت کے ساتھ ایک ہم آہنگ پیرائے میں اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی فلاح کے لئے ان کو بروئے عمل لاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء کی طرح اس کے صفات بھی متعدد ہیں۔ ان کا شمار نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قدرت خداوندی کا کماہی احصاء بشر سے ممکن نہیں کیونکہ وہ اپنی بشریت میں محصور ہے۔ قرآن کے الفاظ میں "تمام اچھے نام اللہ ہی کیلئے ہیں"۔ کیونکہ کمال اللہ ہی کی خصوصیت ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اُن صفات کی اہمیت کو جنکی قرآن میں بطور خاص یاد دہانی کی گئی ہے، انسانی زندگی میں حتی الامکان سمجھنے کی کوشش کرے۔ ان میں سے بعض ایسی صفات ہیں جو روحانیت یا تصوف کے خاص دائرے میں داخل ہیں لیکن ان میں اکثر و بیشتر صفات جو اس کے علم، قدرت، انصاف، رحم اور رحمانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، بآسانی اجتماعی عمرانیاتی مطالعہ کا موضوع بن سکتی ہیں۔ خود ان صفات کی شاندار فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ جو ذات باری تعالیٰ کو کسی ایک صفت میں محصور کرنے یا اسے اوتار بنانے کی نامعقولیت کو کھول کر رکھ دیتی ہے۔ اسلام میں ذات باری

ہر قسم کی صفات سے، اعلیٰ وارفع ہے اور اس کی ہر ایک صفت دوسری تمام صفات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ہی معرض شہود میں آتی ہے۔ انسان کا منصب یہ ہے کہ جہاں تک اس کی فطرت اس کا ساتھ دے سکے، وہ باری تعالیٰ کی صفات کو اپنے نفس میں تخلیق دے۔

قرآن کی صلائے پیہم یہ ہے کہ انسان خارجی عالم کی تخلیقات اور ان کے قوانین عمل کا مطالعہ کرے۔ وہ اشارہ کرتا ہے کہ ان سب میں ہم آہنگی اور توازن کا ایک قانون ازلی جاری وساری ہے تاکہ انسان محویت کے ساتھ ان کا اتباع کرے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ سورۃ الرحمٰن - آیۃ (۵ تا ۷)	سورج اور چاند ایک نظام کے پابند ہیں اور ستارے اور درخت اطاعت کر رہے ہیں۔ اور اسی نے آسمانوں کو بلند کیا اور توازن قائم کیا۔
اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ	(بڑا ہی بزرگ اور عالی شان ذات ہے وہ) جس نے ساتوں آسمانوں کو اوپر تلے کیا۔ تو خدائے مہربان کی اس تخلیق وصنعت میں کوئی خلل یا نقص دیکھتا؟ پھر نظر اٹھا کر دیکھ! کیا تجھے اس میں کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ مکرر دیکھ اور بار بار نظر ڈال کر دیکھ

هُوَ حَسِيْرٌ سورۃ الملک۔ آیۃ (۳ و ۴) — تیری نظر ناکام (عاجز) اور درماندہ ہوکر تیری ہی طرف لوٹ آئیگی۔

جو انسان زندگی کے زینہ پر چڑھ کر زمین پر نائب خدا کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا ہے تو اس کا فریضہ یہی نہیں ہے کہ صرف اپنی ہی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ خارجی دنیا سے بھی اسی طرح ہم آہنگی پیدا کرے۔ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا حکم حیات انسانی کے مختلف منازل کے لئے مختلف مفہوم رکھتا ہے تاکہ انسان درجہ بدرجہ اپنے آپ کو عمل کے رفیع سے رفیع تر فرائض انجام دینے کے قابل بنا سکے۔ قرآنی ہدایات کی روشنی میں جو لوگ یہ عظیم سفر حیات طے کرنے کا اقدام کرتے ہیں ان کا شمار ایک ہی زمرہ میں نہیں کیا جاتا۔ قرآن مجید صراط الٰہی پر چلنے والوں کی، جس اعتبار سے کہ وہ الٰہی صفات کا مظاہرہ کرتے ہیں مختلف انواع قرار دیتا ہے۔ اور ہر ایک کو ایک خاص لقب سے یاد کرتا ہے۔ یہ لوگ صرف قوت ایقان سے نہیں بلکہ اپنے اعمال کی بناء پر اس طرح ملقب کئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر اس شخص کا جو اسلام پر ایمان رکھتا ہے "مومنین" کے زمرہ میں شمار نہیں ہو سکتا جبتک کہ اس کے ایمان کی توثیق اس کے عمل سے موثق نہ ہو۔ یہ انواع مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ صالحین، متقین، مصلحین، مقسطین، صابرین، شاکرین، محسنین، صادقین، صدیقین، شہداء، اولیاء، مسلمین، مقربین، اولوالعلم، اولوالالباب، وغیرہ، لیکن یہ بات یاد رہے کہ ان سب کا ایک مشترک

مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اشیاء کے یزدانی نظام میں جو توازن اور ہم آہنگی موجود ہے وہی لازماً ان کی زندگی میں بھی ظاہر ہو۔

قرآن کی اِن پسندیدہ ہستیوں کے برخلاف چند ہستیاں ایسی بھی ہیں جنہیں قرآن نے واضح طور پر ناپسندیدہ نظر سے دیکھا ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو اس "توازن و ہم آہنگی" میں خلل ڈالتے ہیں جس کا قیام زندگی میں ضروری ہے، یا "زمین پر فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں"۔ ان کی تقسیم بھی، نوعیت شر کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ انہیں کافرین، مشرکین، ظالمین، مفسدین، غافلین، منافقین، وغیرہ سے موسوم کیا گیا ہے۔

قرآن جن کو پسند کرتا ہے انکی امتیازی تقسیم صرف اس بنیاد پر کی گئی ہے کہ دوسروں کے بہ نسبت ان میں کوئی ایک صفت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ صفات کسی انسان میں پائی جائینگی اس کا مقام حیات اتنا ہی رفیع ہوگا اور وہ یقیناً نیابت الٰہی کے لئے زیادہ موزوں سمجھا جائیگا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (سورۃ الانعام آیۃ ۱۶۵)

اور وہ وہی ہے جس نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا اور تم میں سے بعض کے مرتبہ کو دوسروں کے مرتبہ سے بلند کیا تاکہ وہ تمہاری ان چیزوں میں آزمائش کرے جو اس نے تمہیں دی ہے۔

اِن تمام صفات میں جو منصبِ حیات کو پورا کرنے کیلئے انسان کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہییں علم کا درجہ اشرف و افضل ہے۔ اسکی تحصیل ہر مرد اور عورت پر

فرض ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے :۔

تعلموا العلم لانه معالم الحلال والحرام ومنار سبل اهل الجنة وهو الانس في الوحشة والصاحب في الغربة والدليل على السراء والضراء والسلاح على الاعداء والزين عند الاخلاء يرفع الله به اقواماً فيجعلهم في الخير قادة ائمة تقتص آثارهم ويقتدى بفعالهم وينتهى الى رأيهم

علم حاصل کرو اس سے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جنت کی طرف راستہ کھولتا ہے۔ جو کوئی دوست نہ ہو تو یہ اپنا رفیق ہے۔ یہ عسرت کی رہبری کرتا ہے اور مفلسی میں رفاقت کرتا ہے۔ یہ دشمنوں کے خلاف ایک حربہ اور دوستوں کے لئے ایک زیور ہے۔ اسکی برکت سے اللہ تعالیٰ قوموں کے مدارج بڑھاتا ہے اور اچھے اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ اور انہیں امامت عطا کرتا ہے اس حد تک کہ ان کی پیروی کیجاتی ہے ان کے اعمال کی تقلید ہوتی ہے اور ان کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔

جو اولو العلم ہیں وہ فطرتاً ہماری اولین توجہ کے قابل ہیں کیونکہ علم وہ ذریعہ ہے جس سے ان صفات کی تربیت ہوتی ہے جو دوسری انواع کیلئے مخصوص ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور اسطرح گواہی دی فرشتوں نے بھی اور

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۝ سورۃ آل عمران۔ آیۃ (۱۶)
اسی طرح اہل علم نے بھی جو توازن قائم رکھتے ہیں۔

یہ ہے علم کا وہ مرتبہ جو قرآن متعین کرتا ہے مثلاً توابین کی صفت (یعنی ان لوگوں کی جو غیر مسطح راستے کو ہموار کرتے ہیں) یا صالحین کی صفت (جو صراطِ مستقیم پہ چلتے ہیں) یا مصلحین (جو زندگی کو درست کرتے ہیں) یا محسنین کی (جو عمل صالح اس نہج سے انجام دیتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اسکی توفیق ہو تا کہ وہ اسی طرح دوسروں کی غلطیاں درست کر سکیں اور نیک اعمال کریں) یا مُقسطین کی (جو دوسروں کے حق کا اعتراف کرتے، معدلت گستری کرتے اور ان اصحاب کو جو نیک اعمال کرنا چاہتے ہیں نہ صرف اس کا موقع دیتے ہیں بلکہ صالح عمل میں ان کی مدد بھی کرتے ہیں) یا صدیقین کی (جو نکتہ سنجی کے ساتھ حق اور سچائی کا ساتھ دیتے ہیں) یا مسلمین کی (جو خدا کی راہ میں کامل تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں)۔

یہ اور اسی قسم کی دیگر صفات امتیازی اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہیں جسے نعمت علم حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرد اور عورت پر تحصیل علم واجب کر دیا ہے اگرچہ کہ اس کے لئے ملک چین کیوں نہ جانا پڑے جو اس وقت کی دنیا کی بعید ترین سرحد سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ایک چیز جس کی صاف طور پر قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ علم کا مطلب یہ نہیں کہ کسی ایک موضوع پر دماغ میں کچھ خیالات یا مواد کو جمع کر لیا جائے۔ اسے تحصیل علم نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کا منشا یہ ہے کہ اشیاء میں جو فطری ربط ہے

اس کی معرفت حاصل کی جائے، ایسا عرفان جس کے ذریعہ حقائق اشیاء کی ہم آہنگی کا بخوبی ادراک ہو سکے۔ اس لئے کتاب مقدس میں تحصیل علم کیلئے فکر لازمی قرار پایا ہے

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ٥ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥	ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ انکے درمیان ہے انکو محض کھیل کی خاطر نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم نے انکو اپنی اپنی جگہ بہت ہی ٹھیک یا متناسب انداز میں پیدا کیا۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت) کو نہیں جانتے۔
سورۃ الدخان۔ آیۃ (۳۸ و ۳۹)	

"لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے" یہ وہ المناک اشارہ ہے جو قرآن مجید میں ہر موڑ پر ملتا ہے۔ جہاں کہیں مظاہر حیات پر غور اور تجسس کے ساتھ توجہ کرنیکی ہدایت کی گئی ہے وہاں " وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یا لَا يَفْقَهُوْنَ " جیسے اشاروں کی گونج اور ارتعاشات بار بار سنائی دیتے ہیں۔ ان اشاروں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کی نظر میں عرفان و بصیرت حاصل کرنے کیلئے فکر کی کتنی اہمیت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مخصوص دعا یہ تھی:۔ "اے خدا تو مجھے اشیاء کا ایسا علم دے جیسی کہ وہ ہیں" اس علم کے حاصل کرنے کا جادہ اولین فکر ہے۔

قرآنی تصور کے اعتبار سے علم ہر شعبۂ حیات پر محیط ہے، خواہ کائنات عظیم کی حیات ہو جو انسان کے اردگرد، قریب یا بعید ربط کے ساتھ رو بہ عمل ہے، یا خود حیات انسانی جو اپنے ماضی کے آغوش میں مستقبل کی طرف رو بہ حرکت ہے۔

تحصیل علم میں انسان کو نہ صرف اپنے ذہنی اور جسمانی قویٰ بلکہ اپنے روحانی جوہر کو کام میں لانا ہوتا ہے اور اسلام میں اس کے لئے کسی امر کی ممانعت نہیں ہے۔ سوائے شاید اُس سعیٔ لاحاصل کے جو اس نقاب کے اُٹھانے میں صرف ہو جس تک اسکی عقل اور قوت وجدان کی رسائی ممکن نہیں، یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں قرآنی تہذیب اور قدیم یونانی تہذیب میں جس پر آج کل کی یورپی تہذیب قائم ہے اساسی فرق نظر آتا ہے۔ جہاں یونانی طرزِ فکر نے صرف بنی نوعِ انسان یا انسان بحیثیت انسان کے مطالعے پر اپنی توجہ مرکوز کی وہاں قرآنی ذہن ساری کائنات کو بیک نظر دیکھ لیتا ہے ــــ نہ صرف انسان کی مادی دنیا، بلکہ اسکی روحانی دنیا، سیارے، چرند پرند، مور و ملخ، اور ستاروں کی دنیا، مظاہر اور اعیان کی دنیا، سب پر اسکی نظر وقت واحد میں دوڑ جاتی ہے اس لئے کہ یہ سب اس کے شعور میں رشتہ بہ رشتہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ وہ ہر شئی کی تخلیق کے رازِ درون پر غور کرتا، اسے سمجھتا اور ان سب کے باہمی رشتہ کے اُس عظیم روحانی قانون کا ادراک کرتا ہے جس سے وہ اس حیات متحدہ کے قالب میں خوبی کے ساتھ بیٹھ سکیں۔ سر محمد اقبال لکھتے ہیں: ــــ

"قرآن کا مقصد حقیقی یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر خدا اور کائنات کے ساتھ اسکے ربط گوناگوں کا اعلیٰ شعور پیدا کرے۔ قرآنی تعلیم کے اسی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے گوئٹے Goethe نے اسلام کی تعلیمی قوت پر ایک عام تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن (Eckerman

سے کہا تھا "دیکھا تم نے! ایسی تعلیم کبھی ناکام نہیں ہوتی! ہم اپنے سارے نظامات کے باوجود اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور عام طور سے کوئی انسان بھی آگے نہیں جا سکتا" اسلام کا مسئلہ در اصل دو قوتوں، مذہب اور تہذیب کے باہمی تصادم اور ساتھ ہی ساتھ جذب باہمی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابتداءً عیسائیت کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ عیسائیت کا سب سے اہم نکتہ حیات روحانی کیلئے ایک آزاد مواد کی تلاش ہے جس کو بانیٔ عیسائیت کی عمیق النظری کے مطابق ان قوتوں کے ذریعہ نہیں جو روح انسانی سے خارجی دنیا سے متعلق ہیں بلکہ اس نئے عالم کے انکشاف سے جو اسکے اندر ہے، ترقی پذیر اور رفیع تر کیا جا سکتا ہو۔ اسلام اس عمیق النظری سے پوری طرح متفق ہے لیکن وہ اس کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اس طرح منکشف شدہ نئی دنیا کی تجلی ساری دنیا سے کوئی ہٹی ہوئی شئی نہیں ہے، بلکہ اس کے بطون میں نفوذ کئے ہوئے اور جاری و ساری ہے۔"

قرآن اس امر کی پوری اجازت دیتا ہے کہ انسان اپنے اندر اور خارجی دنیا میں کارفرما قوتوں کو ان کے مناسب مطالعے کے ذریعہ مسخر کرے لیکن وہ ایک شرط پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان کو یہ تلقین کرتا ہے کہ اسکی فطرت میں جو میزان رکھی گئی ہے اس کو وہ اپنے ذہن میں ضبط رکھے، اور اپنے علم کے ذریعہ جو قوت اسے حاصل ہوتی ہے۔ اسے اپنی زندگی میں ان خدائی صفات کے

ذریعہ جلوہ نما کرے۔ جسکی بدولت وہ "خدا کے خاندان سے" محبت کر سکے۔ اور جس کے لئے وہ درحقیقت بدیں غرض خلق کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا رکھوالا بن کر نیابت الٰہی کے فرائض انجام دے سکے۔ اگر ہم اس پیرائے میں بیان کر سکتے ہیں تو کہیں گے کہ فطرت کی اس غیر متشخص پنہاں قوت کو جسے سائنس بروئے کار لاتی ہے ایک شخصیت دی جائے، اور اس میں دوسری مخلوق کی طرح اُس میزان کا شعور پیدا کیا جائے جو اُس میں ودیعت کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس قوت میں انسانیت پیدا کیجائے اور بقول قرآن "اللہ کی روح اس میں پھونکی جائے" انسانی عمل کا یہی اولین منصب ہے۔ اور اگر "اٰمنوا وعملوا الصالحات" کے مفہوم و مضمرات کا صحیح احساس حاصل کرنا ہے تو اس حقیقی منصب عمل کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ اپنی خودی اور خارجی دنیا سے اپنے روابط کا ادراک و شعور جس حد تک عمیق و شدید ہو گا اسی حد تک صالحین، متقین، صدیقین، مقربین، وغیرہ، بننے کا موقع حاصل ہو گا۔ جس سے کسی نہ کسی حیثیت میں نیابت الٰہی کا منصب پائے تکمیل کو پہنچتا ہے۔

آخر الذکر قسم جسے مقربین کہتے ہیں۔ یعنی وہ جنہیں خدائے تعالیٰ اپنے قریب کر لیتا ہے ان افراد کی ہے جو الفاظ نبوی میں اشیاء کی معرفت کا جیسا کہ وہ ہیں۔ علم رکھتے ہیں۔ اس حقیقت یا سرچشمۂ حیات کا علم صوفیوں کی اصطلاح کے مطابق "قرب الٰہی" سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ تجربہ ایک اکتسابی صلاحیت ہے جو بہ نسبت ان لوگوں کے جو دنیوی امور میں اُلجھے ہوئے ہیں اُن اصحاب میں زیادہ

پائی جاتی ہے جو روحانیت کی طرف مائل رہتے ہیں۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۝ سورۃ البقرہ۔ آیۃ (۶۰)	اور تمہارے رب نے کہا کہ مجھے پکارو میں تمہیں جواب دونگا۔
وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي ۝ سورۃ البقرہ۔ آیۃ (۱۸۶)	اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو (کہدو کہ) میں انکے نزدیک ہوں اور پکارنے والے کی پکار کا جبکہ وہ مجھے پکارتا ہے جواب دیتا ہوں۔

یہ ایک شعوری کوشش ہے۔جواب فوراً ملتا ہے۔عمل اور رد عمل شانہ بشانہ رونما ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کو اسکی صفات کے توسط سے یاد کرو اور وہ صفات تمہارے اندر نفوذ کر کے تمہاری ہو جاتی ہیں۔اس طرح اللہ کو اسکی صفاتِ کاملہ اور اسکی ذات کے توسط سے جو ان صفات کو ایک وحدتِ کاملہ میں سمیٹی ہوئی ہے، یاد کرو اور تمہیں وہ جوہر ذاتی چھو لیتا ہے اور تمہارے اندر جاری و ساری ہو جاتا ہے۔اس حالت کا نام "قرب الٰہی" ہے۔یہ تجربہ حقیقتِ کامل کی تلاش کا نام ہے اور ایک طرف وہ ایک قسم کی عبادت ہے تو دوسرے طرف دیگر انسانی تجربوں کی طرح یہ ایک میزانِ ادراک و شعبۂ علم ہے۔اس علم کا ذریعہ انسانی ذہن نہیں ہے بلکہ وہ ہے جسے قرآن "قلب" کہتا ہے۔

حقیقت کی صوفیانہ تلاش کے متعلق لکھتے ہوئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں:-

"صوفی کی کتاب روشنائی اور حروف سے نہیں بنتی ہے، وہ برف

کیطرح ایک صاف و شفاف قلب ہوتی ہے۔ عالِم کو قلم کے نشانات ہاتھ آتے ہیں، صوفی کے ہاتھ کیا آتا ہے؟ قدم کے نشانات۔ صوفی ایک شکاری کیطرح شکار کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ غزالِ ختن کا راستہ معلوم کرتا اور اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ کچھ دیر تک تو ہرن کے نقشِ قدم اس کے لئے مشعلِ راہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے بعد تو صرف "خوشبوئے نافہ" ہی اسکی رہبر ہوتی ہے۔ مشکِ نافہ کی خوشبو پر ایک منزل طے کرنا دشت پیمائی اور نقشِ قدم کی سو منزلیں طے کرنے سے بہتر ہے"۔

"خوشبوئے نافہ" کا تعاقب جسے قرآن "فکر" کہتا ہے دراصل حقیقت کی طرف صوفیانہ سفر کا قدم اولین ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو خود ایک صوفی تھے اس سفر کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں:-

"عبادت کے تین حجابات ہیں جن میں پہلا حجاب وہ عبادت ہے جو زبان سے کیجاتی ہے۔ دوسرا وہ ہے جس میں قلب شدید ریاضت اور مستحکم ترین ارادیت کے ساتھ ایسے نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں بڑی خواہشیں اُس پر کوئی اثر نہیں کرتیں اور وہ الٰہی مسائل پر توجہ کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ تیسرا حجاب وہ ہے جبکہ قلب الٰہی مسائل سے کسی طرح ہٹ ہی نہیں سکتا اور عبادت کا اصل مغز اسی وقت

دکھائی دیتا ہے جبکہ معبود حقیقی عابد کے قلب میں گھر کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی خود شعوری نہیں ہوتی اور اگر اسے اپنی عبادت ہی کا خیال آتا ہے تو وہ خیال اس کے لئے ایک حجاب بن جاتا ہے اور عبادت میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ صوفیانہ مشرب کے حکماء نے اس حالت کا نام "جذب" رکھا ہے۔ جس میں سالک اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اُسے اپنے اعضائے جسمانی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ نہیں جانتا کہ خارج میں کیا ہو رہا ہے۔ بلکہ خود اس کے قلب میں کیا گزر رہا ہے اس سے بھی بے خبر ہے۔ جب وہ ان تمام لواحق سے بالکل الگ ہو جاتا ہے تو اُس وقت اپنے مالک حقیقی کی طرف اور پھر مالک حقیقی میں سفر کرنے لگتا ہے۔ اگر اسے اتنا خیال بھی آ جائے کہ کامل حالت جذب میں ہے تو ایک عیب ہے۔ کیونکہ جذب حقیقی کی صفت یہی ہے کہ خود جذب کا بھی شعور نہ ہو۔ اس راہ کی ابتداء رجوع الی اللہ سے ہے اور خدا میں سفر کرنا اس کی انتہا ہے۔ کیونکہ اسی دوسری حالت میں اسے جذب الی اللہ کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ ابتداءً تو یہ ایک ہلکی سی تجلّی کی سی کیفیت ہو گی جو آنکھ بھی محسوس نہ کر سکے۔ لیکن جب اسکی عادت ہو جاتی ہے تو قلب کو عالم رفیع میں لیجاتی ہے۔ اُس رفیع عالم میں جہاں حقیقت اولی کا خالص اور پاک جلوہ نظر آتا ہے اور قلب انسانی میں روحانی دنیا کی شکل و صورت بس جاتی ہے

اور خدا کا جلال اُس پر منکشف اور متجلی ہونے لگتا ہے۔"

صوفیانہ تجربہ ایسا نہیں جو دوسرے کو منتقل کیا جا سکے۔ وہ شدت کیساتھ شخصی اور داخلی ہے۔ البتہ وہ ایک خیال کی صورت میں رونما ہو سکتا ہے۔ "قربِ الٰہی" کا یہی وہ منصب ہے جو ایک شخصی احساس وحدت کو ایک عالمگیر استغاثیت کا محرک بناتا ہے۔ عام طور پر یہ صوفیانہ تجربہ وحدتِ حیات کے صرف ایک خفیف احساس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا:۔

"ایک ایسی شئے کا روح افروز احساس جو بہت عمیق طور پر سرایت کی ہوئی ہے جس کا مسکن غروب ہونے والے آفتابوں کی روشنی، دریائے محیط اور زندہ ہوا۔ فلک نیلوفری اور قلب انسانی ہے، ایک حرکت ایک روح جو ہر غور کرنے والی شئے اور ہر موضوع تصور پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہر شئی میں جاری و ساری ہے۔

گاہ گاہ یہ احساس عمیق تر ہو جاتا ہے اور ایسی کیفیت یا وجدان میں بدل جاتا ہے۔

ایسی پاک وجدان۔
جس میں رمزِ الٰہی کا بار۔
اس سمجھ میں نہ آنے والی دنیا کا
تھکا دینے والا بارِ گراں اُٹھ جاتا ہے۔

وہ پرسکون اور رحمت بھری وجدان جن میں امن و مہر کی (لہریں) ہیں

لئے چلتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس گوشت پوست کے ڈھانچے میں چلتی ہوئی سانس بلکہ ہمارے انسانی خون کی روانی تقریباً رک جاتی ہے اور ہم اپنے پیکرِ خاکی میں محوِ خواب ہو کر ایک زندہ روح بن جاتی ہیں اور ہماری آنکھ نظمِ کائینات کا جلال ہم آہنگی اور مسرت کی عمیق طاقت سے پرسکون ہو کر اشیاء کی حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتی ہے۔ (ٹنٹرن آبی)

واردات کا یہی وہ عالم ہے جس کا انسان خوگر ہو جائے تو یہ اس قدم اولین کی نشان دہی کرتا ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ "اللہ کی جانب سفر" کہتے ہیں۔ اس منزل میں متعدد سنگ میل ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کی معراج "جذب" ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بے شمار پُر خلوص مرد اور عورتیں گزری ہیں جو پہلے "اللہ کی طرف سفر" اور پھر "اللہ میں سفر" کا مسلک اختیار کر کے اس عالمِ خاکی کی طرف واپس ہونے پر مائل نہیں پائی گئیں۔ اپنے اپنے مقامِ سفر کے اعتبار سے انہوں نے اپنی انفرادی ہستیوں کو یقیناً تجلّیِ حق سے منور کیا۔ لیکن یہ جماعت کیلئے کھوئے گئے۔ وہ اپنی انسانی فطرت کے میزان کا لحاظ رکھنے میں قاصر رہے۔ ایسے نفوس کو مجذوب کہا جاتا ہے۔ یہ اس نوع کے افراد نہیں ہیں جو قرآنی اعتبار سے "نیابتِ الٰہی" کے فرائض انجام دے سکتے ہوں۔ اس کے بجائے تاریخ اسلام میں سینکڑوں روحانی شہ سواروں کی ایک شاندار صف ایسی بھی ملیگی جو فرائض انسانی کا پورا احساس رکھتے ہوئے اپنے مقامِ سفر سے انسان کی طرف واپس آئے اور اپنے ساتھ

علم و عرفان کی وہ دولت بھی لئے آئے جو انہیں اپنی راہ معرفت میں حاصل ہوئی تھی اور جسے انہوں نے عام انسانوں میں پھیلا دیا۔ اسکی بلند ترین مثال خود رسول اکرم کی ہے جنہوں نے حق کے قریب ترین مشاہدے اور معرفت کو جبکہ آپ مشرف بہ معراج ہوئے اور جس کا ذکر قرآن کے سورۃ النجم میں ہے ایک عالمگیر تنظیم نو کی صورت میں ڈھال کر پیش فرمایا۔ اس وقت قرآن کا کہنا ہے کہ

فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی ہ
مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ہ
اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ہ
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ہ
لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ہ سورۃ النجم۔ آیۃ (۱ تا ۱۲ اور ۱۷ تا ۱۸)

اس نے (اللہ تعالیٰ نے) اپنے بندے (پیغمبر) پر وحی نازل کی جو کچھ نازل کرنا تھی اور جو اس نے دیکھا اس کے (پیغمبر کے) قلب نے اسکو غلط نہیں جانا۔ اسکی نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بھٹکی۔ اس نے تو اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

رسول اللہ کیلئے یہ صرف ایک منظر خیال نہ تھا بلکہ ایک معنی خیز تجربہ تھا اس معنی خیز تجربہ کو عالمگیر تنظیم نو کے سانچے میں ڈھلنا تھا جو "خاندان الٰہی" سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کا ہر فرد ایک دوسرے کیلئے "گلہ بان ہے"

روحانی یا صوفیانہ تجربہ خواہ وہ کتنا ہی ناقابل انتقال ہو قرآنی مفہوم میں اپنا ایک مقصد رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ تجربہ ایک ایسی متحرک علم کی شان اختیار کرے کہ جس سے انسان میں وہ حرکت عمل پیدا ہو جس سے اس کو زمین پر نیابت الٰہی کے فرائض انجام دینے کے قابل بنائے۔

باب چہارم

مشیتِ الٰہی

قرآن کی جامع ہدایت یہ ہے کہ ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو یعنی ایسا عمل جو علم پر مبنی ہو۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝ — وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوش حالی اور نیک انجام ہے۔

سورۃ الرعد - آیۃ (۲۸)

لیکن کیا انسان اپنے ارادے اور عمل میں آزاد ہے؟ قرآن کی ہر موڑ پر ہمیں ایسی آیات ملینگی جو یہ اعلان کرتی ہیں کہ خدا کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ پھر بھی انسان اپنے عمل کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اور اسے جزا کی امید اور سزا کا خوف دلایا گیا ہے اور پھر اس کے متوازی بیسیوں آیتیں ایسی ملتی ہیں۔ جن میں انسان کو ذہن پر زور ڈال کر حق و باطل میں امتیاز کرنے کی دعوت بھی دیجاتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ :-

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۝ سورۃ الرعد - آیۃ (۱۲) — بیشک اللہ کسی قوم کی حالت میں (اسوقت تک) تغیر نہیں کرتا جبتک کہ وہ لوگ پہلے اپنی حالت کو

نہیں بدل لیتے جو انکے دلوں میں ہے (یعنی جبتک وہ اپنی حالت کو نہ بدل لیں)۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ٥ سورة النجم - آیۃ (۴۰)

نہیں ہے انسان کیلئے مگر صرف وہی جسکی وہ کوشش کرتا ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ٥ سورة الشوریٰ - آیۃ (۲۹)

اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں کی وجہ سے ہے۔

ان بدیہی تضادات سے جو ہمیں آتے جاتے ملتے ہیں کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے؟ کیا انسان اپنے عمل میں اور ارادے میں آزاد ہے یا آزاد ہی نہیں ہے؟ کیا یہ گتھی سلجھائی جا سکتی ہے؟ ایسے ہی سوالات تھے جنکی وجہ سے اوائل تاریخ اسلامی میں ملّتِ اسلامی عمومی حیثیت سے دو نزاعی قوتوں میں بٹ گئی۔ ایک قدریہ جو اس امر کے قائل تھے کہ انسان آزاد اور مختار ہے، دوسرے جبریہ جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انسان کا ہر عمل کلیۃً مشیتِ ایزدی کے مطابق ہوتا ہے جسکا تعین پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔ اگرچہ عہدِ عباسیہ میں اس نزاع نے انتہائی شدت اختیار کرلی، تاہم اوائل عہدِ بنو امیہ ہی میں نظریہ جبریہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں اتنا رس بس گیا تھا کہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق اسے اپنے مقام سے ہٹانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس میں اضمحلال پیدا کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ بیرونی اثرات کے تحت ہوا، لیکن اسکا کلّی استحصال ممکن نہ تھا۔

اس کشمکش میں نظریہ جبریہ کو نہ صرف کامیابی حاصل ہوئی، بلکہ اس وقت سے ابتک یہ نظریہ ذہن مسلم کے ساتھ اس طرح چمٹا ہوا ہے کہ اس اعتقاد میں جو کسی نہ کسی شکل میں قدیم سے مشرق میں رائج رہا ہے جسکی تصحیح قرآن نے کی تھی وہ مسخ ہو کر رہگئی۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر غیر مسلم یورپی نقادوں نے گاہ گاہ اسلام پر بے روک ٹوک حملے کئے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف قرآنی مشرب کو "خالی از محبت" قرار دیا ہے، بلکہ اس کے خدا کو ایک "بے رحم جابر" "ایک بڑا خود سر" اور ایک "غیر ہمدرد ناقابل تسخیر قوت" بنایا ہے۔ چنانچہ پالگریو صاحب (Palgrave) کہتے ہیں:۔

"غلامی اور ذلت کی سب کے لئے بلا امتیاز ایک ایسی سطح مقرر کی گئی ہے جسکی وجہ سے اسلام میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کوئی فوقیت امتیاز یا بلند مرتبت کا جائز دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ سب کے سب ایک تنہا جابر قوت کے یکساں آلہ کار ہیں جو انہیں نقصان یا فائدہ پہنچائے، حق یا باطل کی طرف لیجائے، عزت یا ذلت، مسرت یا غم بخشنے کیلئے، انکی انفرادی صلاحیتوں یا نفع یا نقصان کا لحاظ کئے بغیر، انہیں استعمال کرتی ہے۔ صرف اس لئے کہ اسکی یہی مرضی ہے اور بس"

سر ولیم میور (William Muir) کہتے ہیں:۔

"اسلام میں دنیا کے ساتھ اللہ کا ربط کچھ ایسا ہے کہ نہ صرف

ہر نہج کی آزاد ارادیت بلکہ عقل و فہم کے استعمال کی آزادی بھی ایک بے معنے سی شئے بن کر رہجاتی ہے۔ اللہ اتنا بڑا ہے اور اسکی بڑائی اتنی مطلق ہے کہ اسکے آگے انسان کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ ہر خیر اور شر راست خدا ہی کیطرف سے آتی ہے۔ اِس کے فولادی قید و بند میں امید فنا ہو جاتی ہے، اور مایوسی ایک فلسفہ عام بن جاتی ہے،"

کلارک (Clarke) کہتے ہیں کہ

"اسلام نے خدا کو تو دیکھا، مگر انسان کو نہیں دیکھا اس نے خدا کے مطالبات تو دیکھے، مگر انسانی حقوق نہیں دیکھے۔ وہ اقتدار تو دیکھ سکا لیکن آزادی نہ دیکھ سکا۔ اس لئے اس نے شدید استبدادیت کی صورت اختیار کرلی اور بے جان رسم پرستی کا مظہر بن کر قعر اجل میں ڈوب گیا۔"

ایک مسلمان کیلئے اس قسم کی تنقیدیں تلخ و ناگوار ہونگی، لیکن اس کیلئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اسکی ابتدائی ذمہ داری قرون وسطیٰ کے اُن مسلم علماء اور ان کے متبعین پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے "مشیّت ایزدی" کے قرآنی تصوّر کی جو عمل صالح کا ایک دائمی سرچشمہ تھا، نامناسب تعبیر کی، جسکی وجہ سے عمل صالح کے متعلق قرآن کا اصل مفہوم اور منشاء ذہن انسانی سے پوشیدہ ہوگیا۔ اور خود پسند نقادوں کو اسلام میں شدید تقدیریت کا مفہوم پیدا کرنے کا موقعہ مل گیا۔ سر ولیم میور اور دیگر مصنفین نے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے قرون وسطیٰ کے انہی علماء کی تفسیروں سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی اور ایک قدم آگے بڑھ کر خود قرآن سے سائنٹیفک طریقہ پر

یہ دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ آخر اس کے نزدیک "مشیتِ الٰہی" اور "قضا و قدر" جیسی اصطلاحوں کا حقیقی مفہوم کیا ہے اگر وہ چاہیے تو آسانی کے ساتھ خود رسول اکرم صلعم کے حالاتِ زندگی کی طرف رجوع ہوکر ان سے کچھ جوابات حاصل کر سکتے تھے جیسا کہ اسلام کے ایک مطالعہ کرنے والے پروفیسر اردشیر سھراب جی واڈیا (Prof. Ardaser Sorabjee Wadia) نے جن کا مذہب زرتشتی تھا، اپنی تصنیف "مسیج آف محمد" (Message of Mohammed) میں کیا ہے اسلام پر تقدیریت کے الزام کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

"اگر واقعی ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ مسئلہ تقدیریت کا اثر خود پیغمبر کی زندگی اور عمل سے زیادہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ کیونکہ قرآن کو پیش کرنے والے اور اسکی وضاحت کرنے والے تو وہی تھے۔ لیکن حضرت محمدؐ کے قلمبند شدہ واقعاتِ زندگی سے ان کے متعلق کیا معلومات حاصل ہوتی ہیں؟ ایک زندہ دل عہدِ طفولیت، ایک معروف عہد شباب، ایک بھاگتی جوانی کا زمانہ جس میں انہوں نے ایسے دو تجارتی سفر کیئے کہ جھینوں تپتے ہوئے لق و دق ریگستانوں سے انہیں گزرنا پڑا، ایک بے قرار عہد بلوغ جس میں حیات اور عقبیٰ کے عمیق ترین مسائل پر غور و فکر کرنا تھا، اور جس میں روح کی ایک انتھک عرق ریزی رہی، اور ایک طول کھینچتا ہوا ادھیڑ عمر کا زمانہ جو مقابلتاً سکون سے تو شروع ہوا لیکن انکی زندگی کے انتہائی مجاہدانہ دور پر ختم ہوا، جو غزوات، محاصرات اور مہمات سے

معمور تھا۔ اس قسم کا طویل اور سخت کوشش دورِ عمل جس میں زندگی کے نشیب و فراز، اس کے ناز و نیاز اور کرشمہ سازیاں آتی جاتی رہیں، اُس انداز کا نظر نہیں آتا کہ حالات کو مجہول طریقہ پر قبول کرلیا جائے یا ان حالات پر جس طرح وہ وقوع پذیر ہوں سرِ تسلیم خم کرلیا جائے جیسا کہ تقدیریت کا مفروضہ مفہوم ہے۔ اس کے برخلاف آپ کی زندگی کی رفتار تو کچھ ایسی ہے جس میں جد و جہد اور دلیرانہ سعی و عمل کیساتھ خدائے قادرِ مطلق کی مرضی کا پُرخلوص اتباع ہوسکے۔"

اُن اسباب میں سے جو قرآن پر پردے ڈالنے کے ذمہ دار ہیں سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہمارے قدیم علمائے مذہب کی وہ ناکامی ہے جو انہیں قرآن کے مقصدِ حقیقی کے سمجھنے میں ہوئی، اور جنہوں نے ازمنہ وسطیٰ کے اس مذہب کی داغ بیل ڈالی جو اسلام کے نام سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ قرآن کا حقیقی مقصد انسان کو "سنت اللہ" یا اللہ کے اصولِ حیات سمجھانا ہے اور اس غرض کیلئے وہ ایک خاص اسلوب سے اپنے موضوعات کو کچھ تو محکمات کی صورت میں اور کچھ متشابہات کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن ہمارے قدیم علماء کے پیشِ نظر تو "سنت اللہ" نہیں بلکہ "سنتِ عرب" تھی یعنی عربی مسلمانوں کے وہ آداب و رسوم جن کو حیاتِ نبوی کے بعد پیغمبرِ خدا کی سنت قرار دیکر مختلف فقہی ضوابط میں اس طرح مدوّن کیا گیا کہ وہ ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہیں۔ اور وہ اس عمل میں اتنے منہمک ہوگئے کہ انہوں نے سنت اللہ، فطرت اللہ یا خلق اللہ کے مطالعہ

تشریع پر جو قرآن کے مطابق "دین قیم" یا سیدھا دین ہے کافی توجہ نہیں کی۔ دیکھئے قرآن خود اس خصوص میں کیا کہتا ہے :۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

پس تم یکسو ہو کر اپنا رُخ سیدھے اس دین یا راستہ کی طرف رکھو جو اللہ ہی کا راستہ ہے اور جس پر انسان کو فطرتاً ڈھالا گیا ہے۔ اللہ کے راستہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

سورۃ الروم - آیۃ (۲۹)

واضح یاد کہ "فطرت اللہ" اور خلق اللہ درحقیقت "سنت اللہ" ہی کے مفہوم ہی میں مستعمل ہوا ہے۔ جس کا ذکر سورۃ الفاطر۔ آیۃ (۴۳) میں آیا ہے :۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا

پس تم اللہ کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے اور نہ اللہ کے طریقوں میں کوئی تغیر پائیں گے۔

یہ سنت یہ طریقے اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات اور ہر شے میں نظم اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے وضع فرمائے ہیں اور قرآن کافی احتیاط سے اس پر زور دیتا ہے کہ یہ "سنت اللہ" اور یہ "خلق اللہ" دراصل "خلق الرحمٰن" ہے یعنی یہ کسی "ناقابل تسخیر غیر ہمدرد" یا "بے رحم جابر" قوت کی وضع کردہ نہیں ہے بلکہ ایک "رحمٰن و رحیم" رب کی مقرر کردہ ہے جو خواہ کتنا ہی ماورا کیوں نہ ہو پھر بھی رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ سورۃ ق۔ آیۃ (۱۶)

اور ہر ایک کی آواز سنتا ہے جو اسے پکارتا ہے۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِی ٥ سورۃ البقرہ آیۃ (۱۸۶) یہی سنت اللہ دراصل مشیت الٰہی ہے اور انسان کو ایک پُرامن اور منظم زندگی بسر کرنے کیلئے اس سے ہم آہنگی پیدا کرنی ضروری ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کر دیا ہے کہ سنت اللہ کی تشریح کیلئے قرآن اپنا ایک خاص اسلوبِ بیان رکھتا ہے اور اسی کی موزونیت سے وہ مناسب لفظیات استعمال کرتا ہے۔ "فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ" ٥ سورۃ قٓ۔ آیۃ (۴۵) "قرآن کو یہ انداز قرآن بیان کرو" یہ وہ ہدایت ہے جو خود قرآن نے دی ہے۔ یہ ہدایت خاص طور پر اس لئے ضروری تھی کہ اسے عہدِ نبوی کے اَن پڑھ عربوں کو جن کی زبان اور محاوروں میں اس کا نزول ہوا تھا اپنا مفہوم سمجھانا تھا اور اس انداز میں سمجھانا تھا کہ وہ مطالبِ قرآن کو واضح طور پر سمجھ سکیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥	وہ (اللہ) وہی ہے جس نے اَن پڑھ ناخواندہ لوگوں میں سے ایک کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو انکو اسکی (اللہ کی) آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انکو پاک کرتا ہے اور انکو کتاب اور حکمت (دانائی) سکھاتا ہے اور اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی (صریح) گمراہی میں تھے۔
سورۃ الجمعہ۔ آیۃ (۲)	

یہاں اصل ہدایت یہ ہے کہ کتاب کے اُن انکشافات کو جو اس میں موجود

ہیں اس حکمت یا دانش یا اس مقصد کے ساتھ جو اس میں پوشیدہ ہیں ملا کر سمجھایا جائے۔ اور وہ بھی ایک خاص اسلوب سے جو قرآن کا اسلوب ہے۔ لیکن یہ اسلوب کسی مسلم درسگاہ میں کسی وقت بھی مطالعہ کا موضوع نہیں رہا۔ اس کے برعکس قدیم علماء نے لفظیات قرآن خصوصاً متشابہات کے یا تو لغوی معنی لئے یا ان کی شرح و تفسیر میں قدیم عیسائی مفسرین کی طرح یونانی فلسفہ اور حکمت کے کلیات اختیار کئے، یا علم کلام کے نام سے خود منطقی مفروضے قائم کرکے قرآنی مکاتیب کو انہیں ڈھانچوں میں بٹھانے کی کوشش کی۔ ان میں سے بعض نے جن کی افتاد طبع صوفیانہ تھی اس خیال سے کہ "کتاب والحکمۃ" میں جو لفظ حکمت ہے وہ قرآن کے کسی "باطنی مفہوم" پر دلالت کرتا ہے اور یہ مفہوم خاص طور پر متشابہات میں مضمر ہے، عجیب و غریب باطنی مفہوم پیدا کئے، حالانکہ لفظ حکمۃ کی ہرگز یہ صحیح تعبیر نہیں ہوسکتی جیسا کہ خود قرآن اسکی وضاحت کرتا ہے :—

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	بے شک ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دیکر
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	بھیجا اور ہم نے انکے ساتھ کتاب اور میزان کو
وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ	نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔
بِالْقِسْطِ ۚ سورۃ الحدید۔ آیۃ (۲۵)	(توازن برقرار رکھیں)

یہاں "میزان" کا لفظ کتاب کے ساتھ وہی مناسبت رکھتا ہے جو حکمۃ کا لفظ کتاب کے ساتھ کتاب والحکمۃ میں رکھتا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے لفظ حکمت کا مترادف سمجھنا چاہئے۔ حکمۃ یقیناً میزان ہے،

یعنی وہ عقلی بنیاد جس پر کتاب یعنی وحی قایم ہے، اور بنی نوع انسان کو "توازن قائم رکھنے" اور ایک متوازن زندگی بسر کرنے میں مدد دیتی ہے بہت کم اشخاص نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ متشابہات بھی محکمات کی طرح ان ہی اَن پڑھ لوگوں کو سمجھانے کیلئے تھیں جن کے لئے اور جن کے درمیان اور جن کی زبان میں قرآنی مطالب پیش کئے گئے تھے۔ نتیجتاً متشابہات کا منشاء بھی یہی ہے کہ وہ عوام کیلئے بھی قابل فہم ہوں۔ کسی تشبیہ و استعارہ کا مقصد اگر کسی حقیقت کا حامل ہے تو یہ ہے کہ جو مفہوم سادہ زبان میں ادا ہوا ہے، یا ہو سکتا ہے، اسکی تصویر جامع طور پر بہ یک نظر سامنے آجائے۔ اس لئے قرآنی متشابہات کے ایسے بھی غیر معمولی مطالب نہیں لئے جانے چاہئیں جو محکمات کے مطالب و معانی سے بالکل مختلف ہوں۔

قرآن مجید در اصل جیسا کہ اس کا ادعا ہے ایک اخلاقی ضابطہ حیات ہے۔ اسی لئے اسکے سمجھانے کا طریقہ بھی لازماً راست اور بلا واسطہ ہے۔ ایسے فقروں سے جو بار بار دہرائے گئے ہیں مثلاً "زمین پر چلو پھرو اور پھر تم خود دیکھ لو کہ منکرین کا کیا انجام ہوا" قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ سورۃ الانعام - آیۃ (۱۱) "سمجھنے والوں کیلئے یہاں نشانیاں موجود ہیں" اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ سورۃ الرعد - آیۃ (۴) "ان لوگوں کیلئے جو فکر کرتے ہیں" اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ سورۃ الرعد - آیۃ (۳) قرآن کے انداز تخاطب کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اسلوب مشاہدہ اور

تمثیل کا اسلوب ہے جو ہر ذہنی منزل پر بہ آسانی ہر انسان کیلئے فہم و ادراک میں آسکتا ہے۔ اس اسلوب کی پسندیدگی کا احساس مختلف ذہنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف ہوسکتا ہے، لیکن اسکی عام حیثیت تو صرف ایک ہی رہیگی اور وہ یہ کہ یہ آسانی سمجھ میں آسکے۔

قرآن زندگی کا جو بنیادی تصور پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ سارا عالم تخلیق اور ہر وہ شئی جو اس میں موجود ہے چند مستحکم اور مستقل قوانین کے ذریعہ قائم ہے جو ہر شئی کی فطرت کے مطابق اس کی سرشت میں ہم آہنگی کے ساتھ موجود و کارفرما ہیں۔ یہ قوانینِ فطرت یعنی سنت اللہ، لازماً ناقابل تغیر ہیں اور انسانی زندگی کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اس توازن کی مدد سے جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰهَا۔ اُن قوانینِ حیات کے ساتھ تعاون کرے۔ یہ قوانین قرآنی اصطلاح میں "مشیّتِ ایزدی" کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی امکانی صلاحیت کے مطابق ان پر عمل کرے تاکہ وہ ایک منظم پُر امن زندگی بسر کرسکے۔ قرآنی مفہوم میں اسی کا نام "تسلیم و رضا" ہے۔

اس بنیادی اصول کو ذہن نشین کرنے کیلئے قرآن بار بار انسان کی اُس غفلت کو یاد دلاتا ہے جو اس نے ان چیزوں کو دیکھنے اور ان پر غور کرنے میں روا رکھی ہے جو اس کو صاف صاف نظر آسکتی ہیں۔ فطرت کا وہ وسیع منظر، آسمانوں میں گردش کرتے ہوئے حسین اجرامِ فلکی جن سے زمین کو گردشِ

لیل و نہار اور ظلمت و نور ملتے ہیں، بلند پرواز بادل جو زمین کو شاداب کرنے کیلئے آسمان سے پانی برساتے ہیں، وہ ننھا سا تخم جسے انسان زمین میں بوتا ہے اور جس سے اس کی غذا کے لئے لہلہاتی کھیتیاں اُگتی ہیں، وہ قطرۂ آب جس سے خود انسان اپنا وجود حاصل کرتا ہے، اور اسی قسم کے سینکڑوں اشیاء اسے اشارہ کرتی ہیں کہ ایک قانون رحمانی ۔ خلق الرحمٰن ۔ ان تمام امور کو جنہیں وہ اپنے حواس کے ذریعہ دیکھتا یا محسوس کرتا ہے تھامے ہوئے ہے، قرآن پُرزور الفاظ میں کہتا ہے کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ سورۃ الانبیاء۔ آیۃ (۱۶) "آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے تفریح کیلئے نہیں خلق کئے گئے ہیں"۔ بلکہ ان کا ایک سنجیدہ مقصد و مآل ہے، ہر خلق کی ہوئی شئے اپنے بطون ہی میں رکھے ہوئے قانون کے تابع ہے، تاکہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد پورا کرے۔ انسان جسکی فطرت میں توازن اور امتیاز کی صلاحیت رکھی گئی ہے، اپنے وجود کے جبلّی قوانین سے موافقت کرے اور اُن ضوابط سے بھی ہم آہنگ رہے۔ جو خارجی دنیا میں کارفرما ہیں۔ قرآن کہتا ہے یہی صحیح دین اور یہی ہے سنت اللہ کا اتّباع جس کے لئے انسان خلق کیا گیا ہے اور فطرتاً موزوں ہے۔

اس لئے جب کبھی قرآن اس امر پر زور دیتا ہے کہ کوئی امر بغیر اللہ کی مرضی کے انجام نہیں پاتا تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس شئے میں جو جبلّی قانون کارفرما ہے وہ اپنا کام کر رہا ہے، اور بالآخر وہ اپنی راہ خود طے کریگا۔ زمین پر انسان کا وظیفۂ حیات یہ ہے کہ وہ ان قوانین کو سمجھے، اور ان سے توافق کرے۔

جب کبھی وہ ان کے سمجھنے میں یا ان سے مطابقت کرنے میں کوتاہی کریگا اس کا نتیجہ لازمی طور پر اس کے لئے نقصان رساں ہوگا۔ قرآنی اسلوب میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا گیا ہے:۔ "یہ اللہ کی مرضی ہے" دوسرے الفاظ میں قانون کو اپنا راستہ اختیار کرنا ہی ہوگا اور سبب کو اپنا نتیجہ ظاہر کرنا ہی پڑیگا۔ یہ وہ نظامِ حیات ہے جسے قدرتِ الٰہی نے وضع کیا ہے، اور انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ اس نظام "سنت اللہ" میں کوئی تغیر پیدا کرے۔ یہی وہ اصل مقامِ حیات ہے جہاں انسان لازماً خدائی مرضی کے ساتھ رہنے یا اس قانونِ حیات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے، اگر وہ چاہتا ہے کہ آزادی یا اپنی مرضی کے ساتھ اس سے مستفید ہو۔

قرآن گاہ گاہ ان انسانوں کا ذکر کرتا ہے جو صراطِ مستقیم پر چلنے سے انکار کرتے ہیں، اور اپنی اس حرکت پر شدت کے ساتھ مُصر رہتے ہیں۔ قرآن ان کے متعلق یہ کہتا ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ سورۃ الاعراف۔ آیۃ (۱۷۸) "وہ دل رکھتے ہیں مگر محسوس نہیں کرتے، آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں مگر سنتے نہیں۔" یہاں پھر غفلت اور ارادی غفلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کردہ توازن کے خلاف برتی جاتی ہے۔ اس صورت میں زندگی کا قانون اپنا اثر ضرور دکھائیگا۔ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ سورۃ البقرۃ آیۃ

"ہم نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔" انجام کو ظاہر کرنے کا یہ ایک قرآنی انداز ہے۔

قرآن نے بارہا ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو غلط راہ پر گامزن ہو کر یا کسی قانونِ حیات سے غفلت برت کر درمیان میں سہم جاتے اور آنے والے نتائج پر نگاہ ڈال کر تلافی مافات کیلئے اُلٹے پاؤں ہونا چاہتے ہیں۔ اس وقت وہ قانونِ حیات جس کی طرف وہ لوٹتے ہیں، ایک تازہ توانائی کے ساتھ ان کی مدد کیلئے کارفرما ہوتا ہے۔ (اس طرح) تقدیر یا نتیجۂ لازمی کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یہ مقام توبہ و استغفار کا ہے۔ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ سورۃ الرعد آیۃ (۲۷) "جو کوئی اس کی (اللہ کی) طرف رجوع ہوتا ہے (قانونِ حیات، سنت اللہ کی طرف) تو وہ (اللہ) اپنی طرف رجوع کرتا ہے۔" وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰي نَفْسِهٖ ۝ سورۃ النساء۔ آیۃ (۱۱۱) "جو کوئی گناہ کرتا ہے، وہ خود اپنی ہی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے۔" قرآن اپنے خاص رحیمانہ انداز میں یہ بھی یاد دلاتا ہے۔ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢ ا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ سورۃ الانعام۔ آیۃ (۵۴) "تمہارے رب (پروردگار) نے (ایک قانون) رحم (رحمت) کو اپنے لئے مقرر کر لیا ہے وہ یہ کہ تم میں سے جو کوئی نادانی اور جہالت سے کوئی بُرا کام (گناہ) کر بیٹھے اور پھر اسکے بعد توبہ کر لے اور نیکوکار ہو جائے (اصلاح کر لے) تو بیشک وہ (اللہ) بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" رسول کریم صلعم فرماتے ہیں کہ "انسان اگر ایک قدم

اللہ کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ اسکی طرف دو قدم بڑھتا ہے۔"

جو نکتہ یہاں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ عمل اور اصلاح کا پہلا قدم انسان ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی قانونِ حیات ہے اور یہی مرضی الٰہی۔ افراد کیلئے بھی اور اقوام کیلئے بھی اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۝ سورۃ الرعد۔ آیۃ (۱۲) اللہ کسی قوم کی حالت میں (اس وقت تک) تبدیلی نہیں کرتا جبتک کہ وہ لوگ اس چیز کو نہیں بدل لیتے جو انکے دلوں میں ہے یعنی جبتک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدل لیں۔

انسان کی آزادی فکر و عمل سے متعلق قرآنی الفاظ "ہماری مرضی سے" "ہم نے مقدر کیا ہے" وغیرہ کا مفہوم صاف طور پر حسبِ ذیل آیات سے واضح ہے۔ یہ آیات سادہ ترین زبان میں ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۝ سورۃ العنکبوت۔ آیۃ (۶۹)
وہ لوگ جو ہمارے لئے (ہماری راہ میں) کوشش کرتے ہیں (مشقت اٹھاتے ہیں) ہم ضرور انکو ہماری راہ دکھائینگے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ سورۃ بنی اسرائیل آیۃ (۱۵)
جو شخص صحیح راستہ (راہ ہدایت) اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی ہی بھلائی کیلئے اختیار کرتا ہے اور جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی نقصان کیلئے اختیار کرتا ہے اور کوئی شخص (جو اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے) کسی

اَنِّی لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ سورۃ آل عمران آیۃ (۱۹۵)

میں تم میں سے کسی عمل کرنیوالے کے عمل کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا ۝ فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا ۝

سورۃ الشمس، آیۃ (۷ تا ۱۰)

دوسرے کی (ذمہ داری کا) بوجھ نہیں اُٹھائیگا۔

قسم ہر جان کی اور اسکی جس نے اسکو درست اور ٹھیک بنایا اور پھر اسکو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (اختیار کرنے) کی سمجھ دی۔ پس خوش نصیب (کامیاب و کامران) ہے وہ جس نے اسکو (نفس کو) پاک رکھا اور (بدنصیب) ناکام ہے وہ جس نے اسکو ناپاک اور گندہ خاک آلودہ کر دیا۔

اِس وقت تک یہ امر یقیناً واضح ہو گیا ہو گا کہ قرآن انسانی تجسس پر خواہ وہ فکر کی صورت میں ہو، یا علم کی، یا فعل کی صورت میں کوئی قیود عائد نہیں کرتا سوائے اُن قیود کے جو اُس احساس توازن کی روشنی میں جو فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے وہ خود اپنے اُوپر عائد کر لے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے حدود سے یعنی اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں سے واقف ہوتے ہوئے یہ سوچ لے کہ آیا جو کام وہ کرنا چاہتا ہے مناسب حال ہے یا نہیں۔ احساس توازن کے استعمال کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

اس معاملہ میں رسول اکرمؐ نے خود جو احتیاط رکھی تھی وہ اس دعا سے

ظاہر ہوتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَا يُسْمَعُ ٥ "اے اللہ میں اس نفس سے پناہ مانگتا ہوں جس سے سیری نہ ہو اور اس دعا سے جو تیرے نزدیک قابل قبول نہ ہو" یہ احساس توازن یا قانون ہم آہنگی جو قرآنی اعلان کے مطابق ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے اور اس میں جاری وساری ہے انسانی زندگی کے حدود میں ایک اعلیٰ ترین روحانی قانون بن جاتا ہے، اور انسان کی آزاد مرضی کے ساتھ اس کے ہر عمل میں خواہ وہ اسکی ذات سے متعلق ہو یا دنیائے خارجی سے متعلق ہو نفوذ کئے ہوئے زندگی کے رفیع ترین مقاصد کے حصول کیلئے اسکی توانائیوں کی رہبری کرتا ہے۔ یہی ایمان لانے اور عمل کرنے کا طریقہ ہے۔

"احساسِ توازن" انسان کے اندر ایک ایسی کارگر قوت ہے جس سے اسکے جملہ اعمال کی جانچ ہونی چاہئے۔ اسکو چاہئے کہ جس طرح ایک خارجی منظم زندگی بسر کرنے کیلئے ضروری ہے کہ فطرت کے عام قوانین سے توافق کرے، اسی طرح داخلی سکون حاصل کرنے کیلئے بھی لازم ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کرے جو اس کے باطن میں کارفرما ہیں۔ وَفِىٓ اَنْفُسِكُمْ (آيَاتٌ) ٥ سورۃ الذاریت۔ آیۃ (۴) "اللہ کی نشانیاں خود تمہارے نفوس میں ہیں" یہ مشیّتِ الٰہی کے اجزائے ترکیبی ہیں اور ان سے بھی مطابقت پیدا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ اس عمل توافق میں ایک سخت کوشش مضمر ہے اور یہ سخت کوشش اس شخص کو برداشت کرنی ہی ہوگی جو اس کی زندگی کے منشا کے مطابق عالم بہ عالم منزلِ تکمیل تک پہنچنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت اس عملِ ارتقا سے ملتا ہے جو کارخانہ قدرت میں کارفرما ہے۔ جو تخم زمین میں بویا

جاتا ہے، اسے ایک ذائقہ دار ثمر بننے کیلئے مختلف قسم کی مزاحمتوں سے کافی دیر تک سخت کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ خود نطفہ انسانی کو شکم مادر میں بچے کی شکل اختیار کرنے سے پہلے کتنی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اخلاقی اور روحانی منزلِ تکمیل تک پہنچنے کیلئے انسان کو ناگزیر صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ یہ صعوبتیں اس کی آزمائش اور اسکو ایک خوب تر سانچے میں ڈھالنے کیلئے ہوتی ہیں۔ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ٥ سورۃ الانبیاء۔ آیۃ (۳۵) "تمہاری آزمائش کیلئے برائی اور بھلائی کے ذریعہ ہم تمہارا امتحان لیتے ہیں"۔ یہ ہے زندگی کا قانون، سنتِ اللہ، اللہ کی عادت، یا اس کا طرزِ عمل، اور ہر انسان کو اسے برداشت کرنا، یا اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ یہ انسان ہی کے فائدے کیلئے ہے۔ اس سے اس کا مقام اونچا ہوگا۔ اس سے چون و چرا کرنا گویا خود اپنی ترقی کے مواقع سے انحراف کرنا ہے۔

جب انسان یہ احساس توازن قائم رکھنے میں ناکام ہوتا ہے، یا اپنی زندگی کو اس صحیح زاویہ نظر کے سانچے میں بٹھانے سے قاصر رہتا ہے، تو اس کا یہ عمل ہی اس کے لئے آفت و مصیبت بن جاتا ہے۔ یہ کمزوری بنی نوع انسان کی ایک عام کمزوری ہے، کیونکہ قلب انسانی کی گہرائیوں میں آسائش کی ایک بے قرار تشنگی رہتی ہے اور وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ دنیا اُسے بچھائیگی۔ انسان اپنی خواہش کو اپنے حقوق کا پیمانہ بناتا ہے۔ لیکن دنیا تو اپنی راہ لگی رہتی ہے۔ تو نتیجتاً وہ مایوس ہو کر خدا اور تقدیر کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔

"زمانے کی روش اپنی خاص شرطیں پیش کرتی ہے۔

اور اگر انسان اپنی زندگی کو خوش حال رکھنا چاہے تو ان کی تکمیل ضروری ہے۔
عقل ان شرطوں کا ساتھ دیتی ہے۔
ہم انہیں ٹھکراتے ہیں، اور دنیا کے لئے۔
ایک غیر صحیح راستہ تجویز کرتے ہیں اور اپنے لئے بے جا اقدار۔

ہم دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
اور پھر فضول خرچ بھی بنے رہتے ہیں۔
ہم صحت مند رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔
لیکن اپنے جسم کا بیجا استعمال ترک نہیں کرتے۔
ہم اپنی ہی دعاؤں کو آپ رد کرتے ہیں عنفوان شباب سے لیکر زندگی کے
آخری منازل تک،

ہم تسکین قلب چاہتے ہیں،
پھر بھی ہم اپنے قلب پر نظر نہیں رکھتے۔
ہم مصیبتوں سے بچنا چاہتے ہیں،
پھر بھی گناہوں سے باز نہیں آتے۔
ہم ہمیشہ خوش آئند نتائج چاہتے ہیں لیکن کٹھن ذرائع اختیار کرنے
سے گریز کرتے ہیں۔

ہم وہ نہیں کرتے جو ہمیں کرنا چاہیئے۔
اور جو نہیں کرنا چاہیئے وہ کرتے ہیں۔
اور اس خوش حالی کا سہارا لئے رہتے ہیں۔
کہ کسی نہ کسی طرح ہمارا کام نکل ہی جائیگا۔
لیکن ہمارے اعمال خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے ہم سے قوی تر ہیں۔
(امپی ڈاکلس آن ہیٹنا)

"دنیا کی روش" جس کا ذکر امپی ڈاکلس Empedocles کرتا ہے، قرآنی الفاظ میں اللہ کا طریقہ، یا اس کی سنت ہے۔ یہ ان شرائط کا اثبات کرتا ہے جن سے انسان کو آسودگی حاصل ہو۔ عقل اس کا ساتھ دیتی ہے۔ لیکن انسان اسے ٹھکراتا اور اپنے لئے راستے تراشتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی مصیبت آپ مول لیتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو احمق بناتا ہے اور اپنی ہی حماقتوں کا شکار بنتا ہے۔ بیوقوفی اپنے ہمراہ مصیبتیں لاتی ہے۔ یہ ہے قانونِ حیات، فیصلۂ الٰہی، قسمت یا تقدیر۔ قرآن کہتا ہے:۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ٥ سورة الشوریٰ۔ آیۃ (۲۹) "جو مصیبتیں تم پر آتی ہیں وہ اپنے ہاتھوں آپ لائی ہوئی ہوتی ہیں۔"

قرآن میں لفظ تقدیر تین وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اولاً وہ جسے ہم مشیتِ ایزدی یا قانونِ قدرت کی کارفرمائی سے موسوم کرتے ہیں یعنی فطرت اللہ، خلق اللہ، یا سنت اللہ۔ یہ زندگی کے اس منصوبہ کے خدوخال ہیں

جن کو لازماً پہلے ہی سے سوچ لیا گیا تھا، یا جو ارادۂ ماقبل کا نتیجہ ہیں، جس طرح ہر انسانی منصوبہ اس کے عمل میں لانے سے قبل ارادۂ ماقبل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ انسان کے منصوبے میں پیش آنے والے امور کی ماہیت کا علم چونکہ محدود ہوتا ہے، اس لئے اپنے تجربہ کی بناء پر وہ انہیں بدلتا رہتا ہے، لیکن خدا کا علم چونکہ ہر شئی کے متعلق کامل اور محیط ہوتا ہے اس لئے اس کی اختیار کردہ روش میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ خدا اپنے معیّن طریقوں، یا قوانین فطرت، یا زندگی کے مبادی اصولوں اور ان کے اتار چڑھاؤ کو کبھی نہیں بدلتا۔ یہ بلا شرکت غیر الٰہیت کے خاص میدان ہیں اور انسان بہ حیثیت انسان ان سے باز پرس کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رکھتا، کیونکہ وہ ان قوانین کے عمل کو نہ تو صحیح زاوئے سے دیکھ سکتا ہے اور نہ ان کی حیثیت کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ایمان رکھنا ہے کہ یہ "خلق الرحمٰن" یعنی وہ قوانین ہیں جن کو خدا نے بنایا ہے، اُس خدا نے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ اس لئے وہ لازماً خیر ہیں۔ انسان کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وہ ان کا صحیح استعمال کرے۔ ان قوانین کے ساتھ ہر ردِّ عمل کا نام تقدیر ہے۔

تقدیر کا دوسرا مفہوم خود انسان کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتا ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۝ سورہ بنی اسرائیل آیۃ (۱۶)

جو شخص صحیح راستہ (راہِ ہدایت) اختیار کرتا ہے وہ اپنی ہی بھلائی کیلئے اختیار کرتا ہے اور جو غلط راستہ (گمراہی) اختیار کرتا ہے وہ تو اپنے ہی

نقصان کے لئے اختیار کرتا ہے۔

بھلائی یا بُرائی کیلئے ہمارے اپنے اعمال ہی فیصلہ کن قوت ہیں۔ یہ بھی تقدیر ہے۔ اس مقام پر انسان اپنی قسمت کا آپ معمار ہے۔ وہ احساس توازن جو اسکی فطرت میں رکھا گیا ہے، یا وہ قوتِ فرق و امتیاز جو اس میں ودیعت کیگئی ہے، ہر حالت میں اس کے لئے آخری رہبر ہونا چاہیئے تاکہ وہ آسانی سے فرق کر سکے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہ کرنا ہے۔ انسانی طرزِ عمل سے متعلق قرآن نے چند قطعی احکام صادر کئے ہیں، اور وہ ایسے ہیں کہ عقل اور تجربہ اسکی بآسانی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ احکام نظم و امن کیلئے کام کرنیوالے اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور اس کا پتہ دیتے ہیں کہ زندگی میں کن امور سے پرہیز کرنا چاہیئے اور کن امور کو اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ احکام و ہدایت ان اصولوں کو اُجاگر کرتے ہیں جو عالم فطرت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کارفرما ہیں۔ اس نکتۂ نگاہ سے انہیں بھی "مشیتِ الٰہی" کی علامتیں تسلیم کرنا اور ان سے بھی توافق کرنا ہوگا۔ ان سے موافقت کرنے یا ناموافقت برتنے سے متضاد نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو بھی تقدیر کہا جاتا ہے۔

آخر میں ہمیں اُس ردِّ عمل پر بھی غور کرنا ہوگا جو دوسروں کی وجہ سے ہماری زندگی پر رونما ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان سے ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مسرت بظاہر غیر متوقع معلوم ہوگی لیکن دوسروں کے اچھے کاموں سے خوشی حاصل کرنیکی صلاحیت خود ہماری نیک نفسی و نیک نہادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تقدیر کی یہ بھی ایک شکل ہے۔ بعض اوقات دوسروں کے اعمال ہمارے لئے رنج و مصیبت لاتے ہیں۔

"نہ خود ہماری اپنی کوئی کمزوری ہماری زندگی کی بربادی کا باعث نہیں

نہ قدرت کی غیر بشری قوتیں ہمارے لئے مصیبت لاتی ہیں،

لیکن دوسروں کی بداعمالیاں ہماری زندگی کو اکثر تاریک بناتی ہیں"۔[9]

اس مقام پر تقدیر دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ان مصیبتوں کا شکار ہوئے ہیں انہوں نے وقت پر ان بُرے رجحانات کا اندازہ نہ کیا ہو جو دوسروں میں اُبھر رہے ہوں، اور اس لئے انہوں نے ممکنہ مناسب طریقے پر ان کا ضروری تدارک نہ کیا ہو یا ان کی غلط کاریوں کو نہ روکے ہوں۔ یا دیدہ و دانستہ وہ مداخلت کرنے سے باز رہے ہوں۔ ایسی صورت میں کنارہ کشی کا خمیازہ بھگتنا لازمی ہے۔ اس کا اطلاق انفرادی زندگی یا قومی یا بین الاقوامی زندگی پر یکساں ہوتا ہے۔ اس دنیا کی بہت سی مصیبتوں کو بشمول اُن آفتوں کے جو جنگ سے پیدا ہوتی ہیں وہ اشخاص بہ آسانی روک سکتے ہیں جو بے اعتنائی یا رواداری کے غلط تصور کی وجہ سے جو بعض اوقات گرد و پیش کے حالات سے مجرمانہ غفلت کی حیثیت رکھتے ہیں، شر و فساد کو پھیلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔ نتیجتاً صرف اس شخص پر آفت نہیں آتی جو بُرے اعمال کا مرتکب ہوتا ہے، بلکہ وہ لوگ بھی اِس کا شکار ہو جاتے ہیں جو بظاہر تو معصوم نظر آتے ہیں لیکن جو غلط کاریوں کو روکنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہ ہے، قانونِ حیات، یہ ہے تقدیر۔ وقت پر دوسروں کی بُرائی کے انسداد سے بے پرواہی برتنا درحقیقت اس شر میں حصہ لینے کے برابر ہے۔

اس مقام پر ہمارے سامنے قرآن کا وہ مسئلہ آتا ہے جو جہاد کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی کفر کی طرح ایک ایسی اصطلاح ہے جو ان غیر مسلم حلقوں میں قابل نفرین قرار پاتی ہے جو اس کے قرآنی مفہوم سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اس اصطلاح کے لغوی معنی ہیں "سخت کوشش" یا ہر اس برائی کے خلاف کوشش جو خیال یا احساس یا عمل میں موجود ہو۔ یہ پُرامن زندگی کیلئے ایک شرط لازم ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بلند ترین اور صبر آزما صورت وہ جہاد ہے جو خود اپنے نفس کے برے رجحانات کے خلاف کیا جائے۔ اندر سے اٹھنے والی مذموم خواہشوں کے خلاف جنگ کرنا اور زندگی کو ان راستوں پر لے آنا جن سے سکونِ باطن حاصل ہو، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے جہاد سے مراد ان لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا ہے جو دنیا کے امن میں خلل انداز ہونے پر تلے ہوں، یا زندگی کی نیکیوں کو تباہ کرنے کا عزم رکھتے ہوں، لیکن اپنے نفس سے جہاد کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے اسے جہاد اکبر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اپنے نفس سے جہاد کرنے میں دریغ کرنا اپنی خودی کو عمداً تحلیل کرنا ہے۔ اسی طرح بہرصورت اپنی فکر اور عمل سے اپنے اطراف کی برائی کا انسداد نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اجتماعی مسرتوں کی شکست وریخت میں حصہ لینا۔ ہم جب کبھی دوسروں کی بداعمالیوں کو روکنے سے دستکش ہونگے تو ان بداعمالیوں کے بُرے نتائج میں ہمیں خود مبتلا ہونا پڑیگا۔ اِس بناء پر دوسروں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہماری زندگی کے

تاریک ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا جیسا کہ امپی ڈاکلس سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس یہ تو وہ سزا یا خمیازہ ہے جو دوسروں کی بداعمالیوں کو آزادی کے ساتھ جاری رہنے دینے کی وجہ سے بھگتنا پڑتا ہے۔

اسی مسئلہ کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ ہم شر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، اس سے جہاد بھی کرتے ہیں، اور ان کے علاوہ بھی جو کچھ ہم سے ہوسکتا ہے کرتے ہیں پھر بھی برائی ہی فتحمند ہوتی ہے اور نتیجتاً اپنے ساتھ مصیبتیں لاتی ہے۔ یہ بھی تقدیر ہے لیکن اس سے زندگی میں احساسِ تاریکی پیدا ہونے نہ دیں۔ کیونکہ یہ احساس ایک قسم کی مایوسی یا شکست کا احساس سمجھا جائیگا۔ قرآن ہمیں اس قسم کے احساس کی بیداری یا پرورش سے منع کرتا ہے۔ اس کو تو برداشت کرنا ہے اور ہماری ناکامی کو ایک اخلاقی فتح میں بدل دینا ہے۔ یہ ہے عمل صالح۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ سورۃ العصر۔ آیۃ (۱تا۳)	قسم ہے زمانے کی بیشک انسان بڑے ہی گھاٹے اور نقصان میں ہے۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور باہم حق کی تاکید اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔
وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً ۝ سورۃ الانبیاء۔ آیہ (۳۵)	تمہاری آزمائش کیلئے برائی اور بھلائی کے ذریعہ تمہارا امتحان لیتے ہیں۔

وہ مصیبت جو سچائی کو قائم رکھنے میں جھیلنی پڑتی ہے ایک قسم کا امتحان ہے اور جو

لوگ اسے برداشت کرتے ہیں وہ میزانِ حیات میں اپنا درجہ اونچا کرتے ہیں، اور صابرین کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ امتحان اُس سفرِ حیات کے لوازم سے ہے جس میں ہمیں حقیقت کی طرف طَبَقاً عَنْ طَبَقٍ، حالت بہ حالت، آگے بڑھنا ہے۔

ایسی ہی ایک حالت تھی جبکہ حضرت عیسیٰ گتسیمنی (Gethsesmane) میں اپنی آخری رات گزارتے ہوئے اپنے روحانی کرب میں یہ پکار اُٹھے تھے "میرے باپ! اگر ممکن ہو تو یہ پیالہ مجھ سے گزر جائے۔ ہاں! میری خواہش کے مطابق نہیں، بلکہ تیری مرضی کے مطابق"[1] یہ وہ الفاظ ہیں جو زمرۂ صابرین میں صرف ایک سلطان ہی کے شایانِ شان ہو سکتے ہیں۔

آخر میں اس موضوع پر سب کچھ کہہ دینے کے بعد کہ جسے تقدیر کہتے ہیں وہ انسانی اعمال کے نتیجہ کی کسی نہ کسی صورت کا نام ہے، یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ خدائے تعالیٰ کیلئے قرآن ایک ایسا میدانِ عمل مختص کر دیتا ہے جس میں انسان کا بہ حیثیت انسان قدم رکھنا ایک فعلِ عبث ہے۔ یہ میدان امرِ الٰہی کا میدان ہے۔ یاد رہے کہ انسان علم و عقل سے کتنا ہی لیس کیوں نہ ہو پھر بھی وہ حسبِ منشاء نتائج کی یقین کے ساتھ توقع نہیں کر سکتا۔ ایک منزل ایسی آ ہی جاتی ہے جبکہ وہ سب کچھ کر لیتا ہے جو انسان کے بس میں ہے۔ پھر بھی نتیجہ نہ اس کے حسبِ دلخواہ نکلتا ہے اور نہ حسبِ توقع۔ اخلاق اور اخلاقی انصاف کی دنیا میں اصل چیز نیک نیتی ہے۔ وہ خود اپنے لئے اپنے تشفی کا سامان رکھتی ہے۔ یہی ہے حقیقی جزاء، یہی ہے اصل انعام۔ ممکن ہے کہ مادّی حدود میں

نتیجہ ابتدائً تشفی بخش نظر نہ آئے لیکن اسکی حقیقی آخری صورت کیا ہوگی اس کا تو علم اللہ کو ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ سورۃ البقرۃ۔ آیۃ (۲۱۶)	ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو نہ پسند کرو اور وہ تمہارے لئے (تمہارے حق میں) اچھی ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے (تمہارے حق میں) بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے۔ تم نہیں جانتے۔
وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ سورۃ ہود۔ آیۃ (۱۲۳)	آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں اللہ ہی سے وابستہ ہیں اور تمام امور اسی کی طرف رجوع ہونگے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے تمہارا رب بے خبر نہیں ہے۔

اس لئے انسان کا فرض بس اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ سیدھی راہ پر عمل کرے اور باقی خدا پر چھوڑ دے۔ وہ اپنے طریقِ عمل کو خدا کے طریقِ عمل کے موافق بنائے۔ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے ساتھ رکھے اور زندگی کی آزمائشوں کو سچائی اور استقامت کے ساتھ برداشت کرے۔ یہی امتیازی ہدایت ہے کتابِ الٰہی کی۔

آخر یہ تو نہیں کہ قبر کی اِس جانب کی زندگی ہی مکمل زندگی ہو۔ اسکے بعد کی زندگی بھی تو اہمیت رکھتی ہے جو اسی کا ایک سلسلہ ہے۔

مَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ ؕ

تم سب کا پیدا کرنا اور پھر تم سب کا دوبارہ جلانا بس ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کا۔

سورۃ لقمان - آیۃ (۲۸)

ممکن ہے انسان کے نیک اعمال کے نتیجے یہاں دکھائی نہ دیں، لیکن عالم آخرت میں تو یہ شیشے کی طرح صاف نظر آئینگے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ہر ممکنہ کوشش کے ساتھ خدا کی مرضی اور اس کے طریقوں کے مطابق اپنی زندگی، محبت، اعتماد اور امید میں بسر کرے اور باقی خدا پر چھوڑ دے۔

یہ ہے اسلام میں زندگی بسر کرنا۔ کوئی تعجب نہیں گوئٹے Goethe بول اٹھا تھا "اگر یہی اسلام ہے تو کیا ہم سب اسلامی زندگی بسر نہیں کرتے ہیں؟" اور کارلائل، (Carlyle) نے جو گوئٹے کا ہم نوا تھا اسی آواز کی صدائے بازگشت دی۔

"مجھے کہنے دو کہ صحیح مشرب زندگی یہی ہے۔ انسان اسی حد تک برسرِ حق ہے، ناقابلِ تسخیر ہے، نیک ہے، اور ایک فتح مبین کی راہ پر ہے جس حد تک کہ وہ اپنے سطحی قوانین، عارضی نمود و نمائش اور سود و زیاں کے محاسبات کے باوجود اسی عظیم قانونِ عالم کے مطابق چل رہا ہے اور اس قانون سے مطابقت کرنا اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ وہ اپنی روح کی پوری قوت کے ساتھ یہ جانے اور تسلیم کرے کہ ایسا قانون ضرور موجود ہے

اور وہ قانونِ خیر ہے۔ ہاں! خیر ہی خیر ہے۔ یہی ہے اسلام کی روح اور شاید عیسائیت کی بھی[12]۔"

قرآن پوچھتا ہے۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	پھر تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟ (بلاشبہ) یہ تو دنیا جہان کے لوگوں کے لئے ایک نصیحت ہے تم میں سے ایسے شخص کیلئے جو سیدھی راہ چلنا چاہے اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہ جو اللہ چاہے جو دنیا جہان کا پروردگار ہے
سورۃ التکویر آیۃ (۲۶ تا ۲۹)	

تو پھر سوال یہ ہے کہ انسان کس طرح اپنے ارادے سے وہ ہی چاہے جو اللہ چاہتا ہے۔ یا کس طرح قانونِ عالم سے ہم کنار ہو جائے؟

باب پنجم
عملِ صالح

اب تک یہ امر واضح ہو چکا ہوگا کہ قرآن کے مطابق حیاتِ انسانی کا مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی میں امن اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کیلئے ایک نظامِ عمل کی صورت میں رونما ہو اور یہ کہ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان اصولوں کے مطابق جو اسکی تہ میں کارفرما ہیں انسان کو اپنے ارادے اور عمل میں ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ اور ہر متنفّس کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ :-

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا ؕ سورۃ البقرہ۔ آیۃ (۲۸۶) "ہم کسی پر ایسی ذمہ داری عاید نہیں کرتے جو اسکی طاقتِ برداشت سے باہر ہو۔"

قرآن کے مطابق انسان پر دو قسم کی ذمّہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو اسکی ذات سے متعلق ہے، اور دوسری وہ جو خارجی دنیا سے متعلق ہے۔ پہلی ذمّہ داری یہ ہے کہ اپنے فکر و عمل میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔ جنہیں "حقوق اللہ" کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی انداز کے ساتھ "حقوق العباد" یا حقوق الناس یعنی خارجی دنیا کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے۔ اول الذکر حقوق یعنے حقوق اللہ دراصل اپنے ہی نفس کے حقوق ہیں۔ اللہ کے حقوق کی ادائی کر

حقیقتاً اپنے ہی ساتھ نیکی کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ ان کی ادائی میں اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت و درستگی کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی اوّلین ذمّہ داری یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کو آواز دے کہ وہ اپنی قدرت سے نفسِ بشری میں آب سے اور اسکی سرشت میں رکھے ہوئے توازن کو مناسب طریقے پر استعمال کرنے کی اس کو توفیق عطا فرمائے۔ یہ خیال اُس قرآنی نصیحت کے مطابق ہے:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

"اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کروگے یا اسکی سنت پر عمل کروگے تو اللہ تمہاری مدد کریگا اور تمہارے قدم مضبوط جما دیگا"

سورۃ محمد۔ آیۃ (۷)

دوسری ذمّہ داری یہ ہے کہ انسان اپنے میں معاشرتی شعور کو ترقی دے، یعنی دوسروں کی فلاح و بہبود کے احساس کو فروغ دے۔ اِسکے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی اور عمل میں دوسروں کے حقوق تسلیم کرے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد اس طرح واجباتِ نفس اور واجباتِ خلق کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، بلکہ یہ زندگی کے ایک ہی انداز اور اس سے پیدا ہونیوالے عمل کی دو حیثیتیں یا دو رُخ ہیں، اور یہ اسکی نشان دہی کرتے ہیں کہ انسان کو کس قسم کا ذہن پیدا کرنا ہے۔ یہی ذہن عملِ انسانی کی ذمّہ داریاں متعین کرنے میں خاص دخل رکھتا ہے۔ رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے:۔ "اعمال نیتوں پر منحصر ہیں"

کیونکہ نیت ذہن کا اشارہ ہے۔ اور عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ نیت کی پاکیزگی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ یہ پاکیزگی اس توازن کے صحیح استعمال سے پیدا ہوتی ہے جو انسان میں ودیعت کیا ہے۔ اور جس کا مقصد یہی ہے کہ احساسِ حقوق اللہ و حقوق العباد یا احساسِ واجباتِ نفس و واجباتِ خلق اس طرح ہم آہنگ ہو جائیں کہ انفرادی اور اجتماعی مفاد یا اپنے اغراض اور نوعِ انسانی کے اغراض میں تمیز باقی نہ رہے۔ یہ ہے عمل صالح۔

تہذیبِ اسلام۔ دراصل اسی راہِ عمل کا نام ہے۔ اس عمل کو بیدار کرنیوالی تلقین رسولِ خدا کی اس ہدایت سے سمیٹ آتی ہے۔ "اللہ کے طریقوں کی تعظیم کرو اور عیال اللہ سے محبت کے ساتھ پیش آؤ"۔ ذاتی حقوق اور دوسروں کے حقوق یہاں سے پہلو بہ پہلو رکھے گئے ہیں۔ تاکہ انسانی عملِ حیات میں ایک وحدت پیدا ہو۔ اپنے خاندان یا اپنی جماعت میں کسی فرد کا مقام کچھ بھی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس دُہری ذمہ داری کا پورا لحاظ رکھے۔ اس طرح کا لحاظ رکھنا درحقیقت خیر ہے۔ اور اس کا لحاظ نہ رکھنا شر ہے۔ زندگی کے ہر دائرۂ عمل میں خواہ وہ جسمانی ہو یا ذہنی ہو، روحانی، سماجی، یا معاشی ہو۔ یا سیاسی، اس امتیاز کو قائم رکھنا لازمی ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جو حلال و حرام میں فرق کرنیوالے اصول کے اندر کارفرما ہے، اور اس ہدایت کی بھی اساس بنتا ہے جس میں انسان سے کہا گیا ہے کہ یَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۝ سورۃ آل عمران۔ آیۃ (۱۰۶) "اچھے کام کی تلقین کرو اور بُرے کام کو روکو"۔ یہ فرق انفرادی

اور اجتماعی زندگی دونوں پر منطبق ہوتا ہے، اور حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں بوقتِ واحد کارفرما ہے۔ "آمنوا وعملوا الصالحات" کے مفہوم کے اعتبار سے عمل صالح انسان کیلئے کوئی اور معنی نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ اس فرق کو ہر عملِ حیات میں ضبطِ ذہن رکھا جائے، خواہ اس کا تعلق اپنی ذات سے ہو، یا اپنے ہم جنسوں سے، یا بے زبان جانوروں سے۔ شفقت پاکیزگی، خلوص، عصمت، محبّت، انس، سچائی، احترام عہد و پیماں، عفو، دیانت داری، انصاف، رحم، وغیرہ، جیسی ذاتی صفات صرف عشرتی فروع نہیں ہیں جن کو جیسا دل چاہا استعمال کیا گیا۔ بلکہ یہ صالح زندگی کے اجزائے لازمی ہیں۔ ان صفات کے برعکس نفرت، ظلم، ناشائستگی، حرامکاری، بد دیانتی، جھوٹ، فریب، غداری، بے وفائی، کمزوروں پر زیادتیاں جن سے سوسائٹی کا شیرازہ بکھر جائے، نہ صرف برائیاں ہیں بلکہ اسلام میں یہ قطعاً گناہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے سختی کے ساتھ نہ صرف ان سے پرہیز کرنا ہے بلکہ استقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ بھی کرنا ہے۔

عملِ صالح کی یہی وہ وسیع تعریف ہے جو قرآن نے پیش کی ہے۔ وہ عملِ صالح جو انسان کو اپنے ساتھ، اپنے ہم جنسوں کے ساتھ، اور دیگر مخلوقاتِ عالم کے ساتھ، امن و سلامتی سے رہنے میں مدد دیتا ہے۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنا عین اسلام ہے۔ جس کے معنی ہی امن و سلامتی ہے۔ یعنی وہ امن و سلامتی جو اپنے جملہ قوائے عمل کو مرضی الٰہی سے وابستہ کرنے سے حاصل ہو۔ وہ مرضی الٰہی جسکی وضاحت پہلے ہو چکی ہے، سوائے اس قانونِ حیات کے کچھ نہیں ہے جو اسکے

بے پایاں خیر کی بدولت اس طرح تشکیل پا یا ہے کہ حیاتِ انسانی میں وہ ہم آہنگی پیدا کرے جو کائناتی زندگی میں کار فرما ہے۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کو بھی اس قانون ہم آہنگی کے مطابق بنانے کی سعی کرے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

"بلاشبہ میری عبادت اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب ربّ العالمین کیلئے ہیں"

سورۃ الانعام - آیۃ (۱۶۳)

جب زندگی کی یہ صورت ہو جائے تو پھر انسان کا ہر عمل روحانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو عمل صالح کو تمام دوسرے انسانی اعمال سے تمیز کرتا ہے۔ عمل صالح کے اظہار کا دائرہ کچھ بھی ہو، حقوق اللہ یا حقوق العباد، وہ اصل روح جو اسکی تہ میں کارفرما ہے وہ انسان کی دو روحانی صفات یعنی احساسِ رب اور احساسِ خلق کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ روح ہے جو ایک تیسری صفت یا ذہنی صلاحیت کے اظہار کا پس منظر بنتی ہے یعنی اس احساسِ توازن کا جو انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور نتیجتاً حرکتِ عمل کو وہ خوبی عطا کرتی ہے جسے ہم قرآنی زبان میں تقویٰ کہتے ہیں۔ اسی لئے تقویٰ کی راہ چلنا، یا عمل صالح اختیار کرنا، دراصل اللہ کی سنت یا اسکے قوانین کا احترام کرنے اور "عیال اللہ" پر شفقت و محبت کرنے، یا بقول کارلائل "عظیم قانونِ عالم" سے "منسلک ہو جانے" کے مترادف ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جہاں ہم کو وہ لوگ، مرد اور عورت ملیں گے جن کو قرآن صالحین، متقین، صابرین،

اولو الابصار اور اولوالالباب وغیرہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور جن کے بغیر انسانی زندگی بے کیف ثابت ہوگی۔ جب کبھی کوئی مسلم سچّے دل سے خدا کو آواز دیتا ہے اور کہتا ہے:۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۝ سورۃ فاتحہ۔ آیۃ (۵و۶)

"مجھے وہ سیدھا راستہ دکھا اور ان صحیح لوگوں کا راستہ جن کو تونے نعمت عطا کی ہے"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے تقویٰ اور عمل صالح کی راہ دکھائی جائے یا اس کی طرف رہبری کیجائے۔ اسلام میں رفیع ترین مقصدِ حیات خواہ کسی فرد کا ہو، یا فرقہ یا قوم کا وہ کوئی مادّی یا سیاسی برتری نہیں ہے جس کے حاصل کرنے کی آرزو تاریخ کے ہر دور میں جاہ طلب افراد کرتے رہے ہیں۔ اس بنیاد پر ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان فرقِ امتیاز کے تصوّر ہی کو اسلام نے اپنے پسندیدہ بین الاقوامی تصوّرِ حیات سے یعنی اس تصوّر سے کہ بنی نوع انسان ایک ہی خاندان، ایک ہی گلہ ہے جس کا ہر رکن ایک دوسرے کے لئے گلہ بان یا رکھوالی ہوگا خارج کر دیا ہے۔ اقوام و ملل کے درمیان برتری کا معیار صرف اجتماعی عمل صالح یا اجتماعی تقویٰ ہی قرار پائیگا۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم نے اپنے اور اپنے پیروؤں کے لئے یہ دعا فرمائی تھی کہ:۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا ھَادِیْنَ غَیْرَ ضَالِّیْنَ

وَلَا مُضِلِّیْنَ ۵ ؎۳

"اے اللہ ہمیں زندگی کے راستہ میں دوسروں کے لئے نمونہ بنا اور ہمیں بھی خود صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما تاکہ نہ خود گمراہ ہوں اور نہ دوسروں کو گمراہ کریں"

اس قسم کا رُجحان اسی وقت ممکن ہے جبکہ ایک شخص حقوق اللہ کے احساس کو حقوق العباد یا حقوق النّاس کے احساس کے ساتھ مربوط کر دے۔ یہ وہ رُجحان ہے جس کے نشوونما کے لئے رسول اکرم صلعم نے خدا سے مدد مانگنے کی اس طرح تبلیغ فرمائی ہے:-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ ۵ ؎۴

"اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں دوسروں کو گمراہ کرنے سے اور خود گمراہ ہونے سے، دوسروں کو ذلیل کرنے سے اور خود ذلیل کئے جانے سے، دوسروں پر ظلم کرنے سے اور خود پر ظلم کئے جانے سے،
دوسروں کو جہالت میں مبتلا کرنے سے اور خود جہالت میں مبتلا کئے جانے سے"

اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُ بِكَ اِنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَعْتَدِیَ اَوْ یُعْتَدٰی عَلَیَّ اَوْ اَکْتَسِبَ خَطِیْئَۃً اَوْ ذَنْبًا

"اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں دوسروں کو مضرت پہنچانے سے اور اس مضرت سے جو دوسرے مجھے پہنچائیں اور خود حدود شکنی سے

لَا تَغْفِرُہٗ ٥ ث تجاوز کرنے سے اور دوسروں کے حدود معینہ
سے تجاوز کرنے سے یا ایسی خطاکاری سے
جس کو تو معاف کرنا نہ چاہے۔"

میں نے پیغمبر خدا کی چند دعاؤں کو یہاں اس لئے پیش کیا کہ قریب ترین راستے سے میں اُس ذہن تک رسائی حاصل کر سکوں جسے قرآن نے پسند کیا ہے۔ کیونکہ دعا، دعا کرنے والے کے دل کی حقیقی تصویر ہوتی ہے۔ اس سے اسکے ذہنی عمل، اس کے خیالات، احساسات، بلکہ عین مقصدِ حیات کو گہری نظر سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ جب انسان اپنے پروردگار اور اپنے خالق کے روبرو کھڑا ہوتا ہے، تاکہ اس کے سامنے اپنے دل کی بات کھول کر بیان کرے، اور اپنی دنیوی کشمکش، اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کو پیش کرکے ان امور کو طلب کرے جو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے لئے ضروری ہیں، تو اس وقت نہ تو کسی قسم کا تصنع ہوتا ہے اور نہ سچائی کے چھپانے اور دبانے کا خیال، نہ شاعرانہ خیالات کی عشرت انگیز نمائش ہو سکتی ہے۔ ایسے لمحات میں اسکی یہ دعا اس کی کسی تڑپتی ہوئی آرزو کا اظہار ہوتی ہے اور اس لئے وہ فطرتاً سادہ اور راست ہوتی ہے۔ یہ اس کے چھلکتے ہوئے جذبات کی آواز ہے، اس کے ذہن کی اس نوعیت کا پتہ دیتی ہے جو اس نے پرورش کی ہے۔

اسلام میں جو دعا بھی تنہائی یا جماعت میں نماز کے اوقاتِ مقررہ یا کسی اندرونی اقتضا یا پکار کے وقت کی جاتی ہے وہ یا تو الفاظِ قرآنی میں ہوتی ہے یا

رسول اللہ کے ان الفاظ میں جو احادیث میں محفوظ ہیں ۔ اگر دعا کرنیوالا ایسے ساتھ خستگی
سے اپنی ہی زبان استعمال کرتا ہے تب بھی اس کا ماخذ قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔
اپنے مالکِ حقیقی کی طرف وہی رجحان، جن الفاظ کو وہ استعمال کرتا ہے ان کے
پیچھے وہی تصور اور ان سے پیدا کی ہوئی وہی روحانی فضا اس کے دل میں تازہ
ہو جاتی ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس پر قرآنی تعلیم حاوی نہ ہو یا
جو رسول اللہ کے عمل میں نہ پائی جاتی ہو۔

آنحضرت ؐ نے ایک بار یہ دعا فرمائی کہ " اے اللہ اسلام کو میرے لئے بہت
خوشگوار بنا دے "۔ یہ ایک مختصر سی دعا ہے ۔ مگر کتنی جامع ہے ۔ دعا کرنیوالا یہاں
یہ خواہش کرتا ہے کہ اسلام کا راستہ اس کے لئے خوشگوار بنا دیا جائے ۔ اسلام کا
وہ راستہ جو عبادت کا راستہ ہے یعنی ہر برائی کے خلاف جہاد کرنے کا راستہ،
اپنی مرضی کو مرضی الٰہی کے مطابق کرنے کا راستہ، اور اپنی جملہ صلاحیتوں کو زندگی
کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کیلئے وقف کرنے کا راستہ ۔ وہ ایسی زندگی طلب
کرتا ہے جسکی تربیت سنت اللہ کی فضا میں ہوئی ہو ۔ یعنی اس قانون کے مطابق
جو سکونِ قلب کیلئے ہماری فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے ۔ یہ وہ فرض ہے جسکی
دائی کمیں بہت کم لوگ ایسے ملینگے جو یہ دعویٰ کرسکیں کہ وہ کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔
پھر بھی ایک سچے مسلمان کو یہ دعا کرنی ہی ہے کہ ایسی کٹھن منزل بھی اس کے لئے
خوشگوار بنا دی جائے ۔

یہ وہ منزل ہے جسکی طرف ہر اسلامی دعا کا رُخ کرنے کی ہدایت ہے ۔

حسبِ ذیل دعاؤں کی نوعیت پر غور کیجئے جو مسلمان کی پابندی کے ساتھ روزانہ پڑھی جانے والی نمازوں میں داخل ہوگئی ہیں یا اس کا جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ ایک وہ عام دعا ہے جس سے ہر نماز شروع ہوتی ہے اور دوسری وہ ہے جو اسکی نمازِ شب میں داخل کی گئی ہے :۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ o اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ o اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ o صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ o غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ o آمِيْن۔ سورۃ فاتحہ۔ آیۃ (۱تا۷)

سب تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے جو بڑا ہی مہربان اور نہایت رحم والا ہے جو روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمکو سیدھی راہ دکھا، راہ ان لوگوں کی جن پر تونے فضل کیا نہ راہ ان لوگوں کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ ان کی جو گمراہ ہوئے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْ مَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ

تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ ؁

اے اللہ ہدایت دے مجھے تاکہ ہو جاؤں میں منجملہ ان کے جن کو تونے ہدایت دی ہے اور محفوظ رکھ مجھے منجملہ ان کے جن کو تونے محفوظ رکھا ہے اور دوست بنا مجھے منجملہ ان کے جن کو تونے دوست بنا لیا ہے اور برکت دے مجھے اس میں جو تونے مجھے عطا فرمایا ہے اور بچا مجھے شر سے اس کے جس کا تونے حکم دیا ہے بیشک۔ تو ہی حکم کا صادر کرنے والا ہے اور تجھ پر کوئی حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ بیشک وہ جس کو تو دوست رکھے کبھی ذلیل نہیں ہوتا۔ اے ہمارے پروردگار تو نہایت ہی بڑا ہے اور بزرگ و برتر۔

یہ دعا جو ہر روز کئی مرتبہ دُہرائی جاتی ہے مسلمان کو اُس زندگی کی خصوصیت بار بار یاد دلاتی ہے جس کی اسے پابندی کرنی ہے۔ یعنی وہ زندگی جو عملِ صالح پر مبنی ہے۔ اسکی شام کی دعا میں بھی یہی آواز گونجتی ہے۔

واضح یاد کہ ہر اسلامی دعا اپنی جگہ ایک عزم یا تہیّہ ہے "سنت اللہ" سے مطابقت پیدا کرنے اور امداد الٰہی حاصل کرنے کا۔ تاکہ انسان اپنے واجباتِ نفس اور اس کے ساتھ واجباتِ خلق یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بخوبی تکمیل کر سکے۔

اَللّٰهُمَّ اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْعِصْمَةَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَالْغَنِيْمَةَ

مِنْ کُلِّ بِرٍّ ؕ

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْاَمْرِ وَاَسْأَلُكَ عَزِيْمَةَ الرُّشْدِ وَاَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَاَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَقَلْبًا سَلِيْمًا وَخُلُقًا مُسْتَقِيْمًا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ؕ

اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے وہ (اوصاف) جن سے تیری رحمت واجب اور تیری مغفرت لازم ہو جاتی ہے اور مانگتا ہوں تجھ سے ہر گناہ سے بچاؤ اور ہر بھلائی کا فائدہ۔

اے اللہ مانگتا ہوں میں تجھ سے ہر امر میں ثابت قدمی، مانگتا ہوں میں تجھ سے سیدھے پن اور نیکوکاری کا ارادہ اور مانگتا ہوں میں تجھ سے تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی اور اچھے طور پر تیری عبادت بجالانے کی توفیق، مانگتا ہوں میں تجھ سے سچ بولنے والی زبان، پاک دل اور سیدھی طبیعت اور پناہ مانگتا ہوں میں تجھ سے ہر اُس شر سے جس کو تو جانتا ہے اور مانگتا ہوں میں تجھ سے ہر وہ بھلائی جو تیرے علم میں ہے اور مغفرت چاہتا ہوں ہر اس گناہ سے جسکو تو جانتا ہے۔

بیشک تو تمام پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔

اس دعا کی روح پر بھی غور فرمائیے۔

اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ ھُوَ عِصْمَۃُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ اٰخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَادِیْ وَاَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیٰوۃُ خَیْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً لِّیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَّاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ

اے اللہ سدھار دے تو میرے لئے میرے دین کو کہ وہ میرے ہر امر کا بچاؤ ہے اور سدھار دے میرے لئے میری دنیا کو کہ اس میں میری زندگی ہے اور سدھار دے میرے لئے میری آخرت کو کہ اس طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے اور مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک کہ زندگی میرے لئے اچھی ہے اور مجھے موت دے جبکہ موت میرے لئے اچھی ہو اور زندگی کو میرے لئے ہر نیکی میں زیادتی کا باعث بنا اور موت کو میرے لئے ہر برائی کے مقابلہ میں موجب آرام کر۔

اس طرح انسان کیلئے موت کوئی خوفناک چیز نہیں ہو سکتی۔ جس چیز سے حقیقتاً انسان کو خوف کرنا ہے وہ برائیوں کی زندگی ہے۔ اور لازم ہے کہ اسی کیلئے انسان اللہ کی حفظ و امان تلاش کرے۔ انسان کو چاہیے کچھ بھی طلب کرے

یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اس کی اصل ضرورت ایک پاکیزہ زندگی حاصل کرنا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ اِلٰی وَجْهِكَ وَشَوْقًا اِلٰی لِقَائِكَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ[11]

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ عِیْشَةً نَقِیَّةً وَمِیْتَةً سَوِیَّةً وَمَرَدًّا غَیْرَ مُخْزِیٍ وَلَا فَاضِحٍ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ[12]۔

اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے تیری لذتِ دید اور تیرا شوقِ ملاقات بغیر کسی ایسی تنگی کے جو مضرت رساں ہو اور بغیر کسی ایسے فتنہ کے جو گمراہ کن ہو۔

اے اللہ مانگتا ہوں میں تجھ سے پاک زندگی، اچھی موت اور ایسا لوٹنا جو نہ رسوا کرنے والا ہو اور نہ شرمندہ کرنے والا۔

اوپر پیش کی ہوئی دعاؤں اور دیگر دعاؤں سے جو قرآن و حدیث میں درج ہیں ایک ایسے ذہن کی بے قراری کا پتہ چلتا ہے جس کا ہر عمل ایک طرف دل کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے احساسِ رب سے ہدایت پا رہا ہے تو دوسری طرف اسی قوت کے ساتھ اپنے زندگی کے متعینہ ذمہ داریوں کے احساس سے بھی متاثر ہے تاکہ وہ آخرت میں اپنی موجودہ زندگی کے اعمال کا فردِ حساب اطمینان

کے ساتھ پیش کر سکے۔

اس لئے اس حیاتِ اُخروی کے خیال کو جو قرآنی الفاظ میں "حقیقی زندگی"[۱۲] ہے ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ حال کی زندگی اس کے لئے ایک زادِ راہ قرار پائے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے آنے والی زندگی کو یقینِ محکم کی سطح تک بلند کر دیا ہے اور اُسے حیاتِ انسانی کیلئے اتنا ہی اہم قرار دیا ہے جتنا کوئی اور یقینِ محکم ہے جس کا اظہار عملِ صالح کے ذریعہ ہو سکے۔

حیاتِ مابعد

کسی نہ کسی صورت میں حیات بعد الموت پر اعتماد کم و بیش ہر مذہب میں پایا جاتا ہے وہ زندگی درحقیقت کیا ہے اسی وقت معلوم ہو سکیگی جب کوئی اس میں داخل ہو۔ وہ ہرگز حیاتِ ارضی کی طرف واپس آنا یعنے پھر گوشت پوست میں ازسرِنو جنم لینا نہیں ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے حیاتِ انسان ایک پھیرنیوالا چکر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خطِ مستقیم ہے اور اسے ہر وقت ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہونا ہے۔ آنیوالی زندگی کی تصویر جو روایات کی صورت میں حدیثی ادب میں داخل ہو گئی ہے اور قرونِ وسطیٰ کے دل و دماغ رکھنے والے مسلمانوں کیلئے بڑی دلکش رہی ہے، چند صورتوں کے سوائے قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔ قرآنی طریقہ یہ ہے کہ صرف اسکی ایک جھلک دکھائی جائے اور وہ بھی اُن پیرایوں میں جنکو امثال، تشبیہ اور استعارہ کہا جاتا ہے اور جن کا منشا ایمائی اور اشارتی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس پار کی زندگی ایسی ہے کہ انسان اپنے موجودہ ماحول میں رہکر بہ مشکل اس کا ادراک کرسکتا ہے یا اسے سمجھ سکتا ہے۔

امثال اور تشبیہات کے ذریعہ جو منظر پیش کیا جاتا ہے اس کا مقصد

یہ ہے کہ صاحب بصیرت اور کم مواد اِن دونوں کی عقل و فہم کو تشفی ہو سکے نیک لوگ ایک امن کی زندگی بسر کریں گے اور غلط کار بے چینی کی۔ یہ ہے وہ تاثر جو ان کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اِن تمثیلوں کا ہماری زندگی سے ماخوذ ہونا ان کے قابلِ فہم ہونے کیلئے ضروری ہے۔ اس لئے حیاتِ مابعد کا مرقع اُسی انداز سے کھینچا گیا ہے اور سمجھایا گیا ہے کہ جنت ایسی آرامگاہ ہوگی جہاں باغ ہونگے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں۔ دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور جہاں خوشگوار صحبتیں ملتی ہیں وغیرہ۔ مگر فوراً اس احتمال کو رفع کیا جاتا ہے کہ جنت کے باغ بالکل دنیوی باغوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس دنیا سے مختلف ہیں۔ وہاں کے ثمر موسموں کے محتاج نہیں ہیں، دریا کا پانی گندہ نہیں ہوتا۔ اس کا ذائقہ بھی جدا ہے، وہاں کے ساتھی پیکرِ خاکی میں نہ ہونگے بلکہ ایک مطہر ہیئت لئے ہوئے ہونگے اور انہیں نہ ضعیفی آئیگی نہ وہ فضول گفتگو کریں گے۔ اس سارے منظر کو ایک حدیثِ قدسی میں سمیٹ لیا گیا ہے جس میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ اِن امثال سے وہاں کی حقیقت کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آسکتی۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے نیک بندوں کیلئے اُس نے ایک ایسی چیز تیار کی ہے جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا، اور کسی انسانی دماغ نے نہیں سوچا۔" اسی طرح وہ امثال بھی جو جہنم کی زندگی سے متعلق ہیں جسمانی تکالیف کی واردات سے ماخوذ ہیں اور ان کا منشاء خطاکاروں کی اس زندگی کی ایک مثال پیش کرنا ہے جس میں وہ اپنے آپکو نئے ماحول میں پائینگے۔ قرآن نے خود اس کی صراحت کر دی ہے۔ قرآن پوچھتا ہے، خود جواب فراہم کرتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ	اور تمکو کیا خبر کہ حطمہ کیا چیز ہے۔" وہ اللہ کی
نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِىْ	بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک
تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ ؕ	جا پہنچے گی"

سورۃ الھمزہ۔ آیۃ (۵ تا ۷)

اس آیت میں جہنّم کی مثال اُس قلب سے دیگئی ہے جو روحانی کرب میں مبتلا ہو۔
جنّت و دوزخ کی دو تصویریں جو قرآن مثالوں کے ذریعہ پیش کرتا ہے روح انسان کی دو مختلف حالتیں ہیں جو ایک ایسے ماحول میں تشکیل پائینگے جو ہماری موجودہ زندگی کی فضاء سے مختلف ہے۔ امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں ال عمران۔ آیت (۱۳۳) سے متعلق رسول اکرم کی یہ ایک گفتگو نقل کی ہے جو شاہِ ہرقل کے قاصد سے ہوئی تھی۔ آیت یہ ہے:۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ	اور اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا	لپکو (دوڑو) اور جنّت کی طرف، جو زمین و
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ	آسمان کی وسعت رکھتی ہے (دوڑو) اور
لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ	جو پرہیزگاروں کیلئے تیار ہے۔

رومی قاصد نے دریافت کیا کہ اگر جنّت سارے آسمان و زمین پر حاوی ہوگی تو پھر دوزخ کیلئے جگہ کہاں ہوگی۔ رسول اکرم نے آہستگی سے استفسار کی صورت میں جواب دیا۔ "وہ بزرگی خدائے تعالیٰ کیلئے ہے۔ جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے؟"[۵] اس بلیغ جواب سے ہمارے پیش کردہ نظریہ پر مزید

روشنی پڑتی ہے۔

ایک اور طریقہ سے اس نظریہ پر غور کیجئے۔ قرآن کے بموجب ہر شخص کو دوزخ سے گزرنا ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا	اور تم میں سے کوئی نہیں جسکا اس پر سے گزر نہو۔ اس بات کا تمہارے رب نے حتمی طور پر
سورۃ مریم۔ آیۃ (۷۱)	فیصلہ کر دیا ہے۔

چند قدیم طرز کے مفسرین کا یہ خیال ہے کہ اس آیت میں ایک پُل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دوزخ پر ہے اور جس پر سے ایک روایت کے مطابق ہر شخص کو روزِ قیامت ہو کر گزرنا پڑیگا۔ ۹

یہ خیال عجیب طریقے سے اُس خیال کے متوازی ہے جو خاص کر قدیم زرتشتیوں میں رائج تھا۔ قرآن میں تو اس قسم کے پل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ جس حدیث میں پل صراط کا ذکر آیا ہے خود اسی میں اس استدلال کی بھی تائید موجود ہے کہ دوزخ اور جنت حیات مابعد میں روح کی دو حالتوں کا نام ہے۔ اہلِ ایمان سے دوزخ پکار کر کہیگی۔ "اے ایمان والے اس پُل پر سے گزر جا کیونکہ تیرے نور نے میری آگ بجھادی ہے"

مولانا جلال الدین رومی نے جو شاعر بھی ہیں اور صوفی بھی ہیں اپنی مثنوی جلد دوم کے صفحہ ۴۸۸ اشعار (۲۵۵۴ تا ۲۵۶۸) میں اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ :-

مومنان در حشر گویند اے ملک — نی کہ دوزخ بود راہ مشترک

۲۵۵۵ مومن و کافر برو یابد گزار — ماندیدیم اندرین او دو دونار

نک بہشت و بارگاہِ ایمنی — پس کجا بود آن گزرگاہ دنی

پس ملک گوید کہ آن روضۂ خضر — کہ فلان جا دیدہ اید اندر گزر

دوزخ آن بود سیاستگاہ سخت — بر شما شد باغ و بستان و درخت

چون شما این نفس دوزخ خوی را — آتشی گبر فتنہ جوئے را

۲۵۶۰ جہد ہا کردید و او شد پر صفا — نار را کشتید از بہر خدا

آتش شہوت کہ شعلہ می زدی — سبزہ تقوی شد و نور ہدی

آتش خشم از شما ہم حلم شد — ظلمت جہل از شما ہم علم شد

آتش حرص از شما ایثار شد — وآن حسد چون خار بد گلزار شد

چون شما این جملہ آتشہای خویش — بہر حق کشتید جملہ پیش پیش

۲۵۶۵ نفس ناری را چو باغی ساختید — اندرو تخم وفا انداختید

بلبلان ذکر و تسبیح اندرو — خوش سرایان در چمن ہر طرف جو

داعی حق را اجابت کردہ اید — در جحیم نفس آب آوردہ اید

دوزخ ما نیز در حق شما
سبزہ گشت و گلشن و برگ و نوا

جہنم اور جنت کی ماہیت کچھ بھی ہو اس کا اعتراف تو کرنا ہو گا کہ مشیت ایزدی کی تکمیل میں دونوں مقامات کی زندگی اس مقصدِ حیات کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہے جو

اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر ہے اور جس میں خود انسان تخلیقی ارتقاء کی ایک اہم منزل قرار پاتا ہے کیونکہ یہ امر واضح ہے کہ دوزخ اور جنت خواہ وہ روح کی حالتیں ہوں یا کچھ اور، ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہ سکتے۔ اس سے مقصدِ تخلیق میں ایک جمود پیدا ہوگا، اور منشاءِ تخلیق برہم ہو جائیگا۔ قرآن نے خاص احتیاط سے اس مقصد کی وضاحت کی ہے:۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝

سورۃ الانشقاق - آیۃ (۱۹)

تمہیں ایک (منازلِ ہستی کو) درجہ بدرجہ (ایک پست حالت سے ارفع حالت کی طرف) مسلسل یقیناً لے جایا جائیگا۔

یہ وہ وعدہ ہے جو نیک اور بد دونوں سے ایکساں طور پر کیا گیا ہے تو اس وعدے کا ایفا کس طرح ہوتا ہے؟

قرآن بار بار اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ دنیا کا نیک اور بد دونوں قسم کا انسان زندگی کی دوسری منزل کیلئے اپنے دنیوی اعمال کے اثرات اپنے ساتھ لیجائیگا جو اس کی روح پر ناقابلِ محو طریقہ سے مرتسم ہونگے۔ اس کا عمل، اسکا خیال، اسکی گفتگو، اس کا احساس، اور اس کا تصور۔ یہی نہیں بلکہ اسکی خوش فہمیاں اور توہمات بھی، اسکی گردن سے مضبوطی کے ساتھ چمٹے ہوئے رہینگے اور اس زندگی کی نشان دہی کرینگے جو اس نے اس دنیا میں بسر کی تھی۔

وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ

اور ہم نے ہر شخص کے نامۂ اعمال کو اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے دن

الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝	ہم اسے کتاب کی شکل میں اس کے واسطے
اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ	نکال کر سامنے کر دینگے وہ کھلا ہوا پائیگا
الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝	(اور کہا جائیگا کہ) اپنا نامۂ اعمال پڑھ۔
سورۃ بنی اسرائیل - آیۃ (۱۳ تا ۱۴)	آج تو اپنے اعمال کے حساب کیلئے خود ہی کافی ہے۔

اس نئی منزلِ حیات کے مخصوص طریقوں کے مطابق ہر شخص کو اپنی اُس زندگی کے حُسن و قُبح کا مشاہدہ کرنا ہوگا جو اُس نے عہد گزشتہ میں بسر کی تھی، لیکن جسے کج فہمی اور اللہ کی نشانیوں سے عمداً رُوگردانی کے باعث بطور خود دیکھنے سے انکار کیا تھا، حالانکہ اس کے پاس وقت بھی تھا، اور موقع بھی تھا کہ وہ توبہ و استغفار کرے۔ نیز وہ اس "توازن کی مدد سے جو اس کی سرشت میں ودیعت تھا" کفارۂ ماضی بھی کر سکتا تھا۔ موت کے بعد کی منزل میں اس کی حیاتِ ماضی کے حُسن و قُبح اس کے روبرو پیش کئے جائینگے اور ایسی ہیئت میں پیش کئے جائینگے جنہیں اپنی نئی تشکیلِ حیات میں وہ یا تو خوشی کے ساتھ مشاہدہ کریگا یا بے بسی اور کرب کے عالم میں دیکھے گا۔

قرآنی نقطۂ نظر سے حیاتِ احسن یہی ہے کہ تکمیل کی منزل کی طرف بڑھتے ہی چلے جائیں۔ اسی طرح حیاتِ قبیح کو پہلے پہل ایک خاص طریقۂ تطہیر سے گزرنا ہوگا۔ اول الذکر کیلئے راستہ صاف ہے اور دوسری کیلئے اپنی کیفیاتِ نفسی کے مزاحمات کو سر کرنا ہوگا۔ موقفِ اول کو "قُرب" اور موقفِ ثانی کو "بُعد" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ "بُعد" اس کی دنیوی خطاکار زندگی کا ایک عکس ہے یعنی

وہ دوری جو اس نے دنیوی زندگی میں اُلجھ کر خدائے تعالیٰ سے اختیار کی تھی۔

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝ سورۃ بنی اسرائیل۔ آیۃ (۷۲)	اور جو اس دنیا میں اندھا رہا۔ سو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہیگا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس طرح یہ دوری جو "وجہ اللہ" یعنی دیدارِ الٰہی سے نتیجۃً پیدا ہوگی انسانی روح کیلئے بہت تلخ رہیگی۔ قرآنی الفاظ میں وہ اس کیلئے جہنم رہے گی جس طرح کہ نیک انسان کیلئے جنت رہیگی۔ چنانچہ ایک مومن کی پُرخلوص یہ دعا ہوتی ہے:

اللھم انی اسئالك لذة النظر الیٰ وجهك وشوقاً الیٰ لقائك فی غیر ضراء مضرة ولا فتنه مضلة ۔ ۱۱

اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے تیری لذّتِ دید اور تیرا شوقِ ملاقات بغیر کسی ایسی تنگی کے جو مضرت رساں ہو اور بغیر کسی ایسے فتنہ کے جو گمراہ کن ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآنی مفہوم میں دوزخ و جنّت کی ابتدا انسان کی دنیوی زندگی ہی سے شروع ہو جاتی ہے، کیونکہ جو کچھ بھی نیک و بدعمل وہ یہاں کرتا ہے وہ فوراً اُس کا جزءِ حیات بن جاتا ہے، اور نتیجتاً اسے ملنے والی دوزخ یا جنّت کا قبل از قبل مزہ چکھنے لگتا ہے۔ نیک عمل سے روحانی رفعت

ہوگی اور عملِ بد سے احساسِ تنزل پیدا ہوگا۔ اگر انسان اپنی موت سے قبل اپنے اعمال کی بدصورتی محسوس کرلے، اور تہِ دل سے توبہ و استغفار کرلے، اور نیکی کی طرف لوٹ آئے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اسے اطمینانِ قلب عطا کرنے کیلئے ہمیشہ موجود ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ سورۃ السجدۃ۔ آیۃ (۲۱)

اور ہم لازمی طور پر اس بڑے عذاب کے آنے سے پہلے دنیا کے چھوٹے عذاب کا مزہ بھی چکھائیں گے۔ ممکن ہے یہ لوٹ آئیں۔

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۝

سورۃ الشوریٰ۔ آیۃ (۲۵)

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور خطائیں بخش دیتا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اُسے جانتا ہے۔

یہی وہ طریقہ ہے دوزخ سے گزرنے یا ناپاکیوں کو جلا ڈالنے کا جس سے انسان پاک ہوکر جنت میں داخل ہونے کے قابل بن سکے۔ گناہوں کی بدصورتی کو محسوس کرنا فطرتاً تکلیف دہ چیز ہے۔ وہ ایک ذہنی یا روحانی کرب کی کیفیت ہے جو قرآنی زبان میں "جہنم کی آگ" کہلاتی ہے۔ تطہیر کا یہ راستہ عادی گناہ گاروں ہی کیلئے ضروری نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کیلئے بھی ضروری ہے جو عادتاً نیک تو ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی جادۂ تقویٰ سے ہٹ جاتے ہیں، کیونکہ کوئی انسان خطا سے

عاری نہیں ہے۔ یہ نیک لوگ تکمیل کی طرف بڑھنے کی آزادی کا لطف اٹھانے کیلئے ہر طرح سے تیار رہینگے، لیکن انہیں اپنے اس کوچ سے قبل ہر اس مزاحمت کو دور کر دینا ہوگا جو ان کی ترقی میں حائل ہو۔ قرآنی تنبیہ کے مطابق انہیں بھی جنّت میں داخل ہونے سے پہلے دوزخ سے گزرنا ہوگا۔[۱۲] جو حقیقی نیک بندے ہوتے ہیں وہ اپنی ہر اس غلطی کی ماہیت کا تکلیف دہ اندازہ کرکے جو اُن کی دنیوی زندگی میں اُن سے سرزد ہوئی ہے اس دنیا ہی میں اپنا یہ کام پورا کر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ موت سے پہلے وقت پر توبہ و استغفار کر لینے اور روحانی طہارت حاصل کرنے کا ہے۔ ان ہی کیلئے قرآن کا یہ خطاب ہوگا۔

يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ	اے وہ روح جو آرام سے ہے اپنے پروردگار
إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً	کی طرف واپس آ۔ خوش ہو کر اور خوش کرتے
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي	ہوئے۔ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور
جَنَّتِي ٥ سورۃ الفجر۔ آیۃ (۲۷ تا ۳۰)	میری جنت میں داخل ہو جا۔

اُنہیں پاک ہونے کے لیے اس تطہیر کی چکّی سے گزرنے کی مزید کوئی ضرورت لاحق نہ ہوگی کیونکہ وہ اپنی دنیوی زندگی ہی میں اس سے گزر چکے ہیں۔ البتہ یہ طریقہ اُن لوگوں کا انتظار کریگا جنہوں نے "توبہ" کے عمداً مواقع کھو دئے حالانکہ ان کے پاس وقت تھا۔ یہی وہ لوگ ہونگے جو زندگی کی دوسری منزل میں امتحان سے گزرنے کے یا ایک حدیث شریف[۱۳] کے مطابق جنت میں داخل ہونے سے قبل آگ سے پاک کردئے جائینگے۔ تاکہ منزلِ تکمیل کی طرف وہ اپنا کوچ جاری

رکھ سکیں۔

"وہ تمہیں ایک پست حالت سے ارفع حالت کی طرف مسلسل یقیناً لے جایا جائیگا"

یہ ہے وہ منصوبۂ حیات جو قرآن کے پیش نظر ہے۔ "حیاتِ جمیل" کو عالم بہ عالم آگے بڑھایا جائیگا تا آنکہ وہ منزلِ تکمیل کو پہنچ کر خدا کا عین دیدار دیکھ سکیگی۔ اس کے برعکس "حیاتِ بد" فطرتاً پیچھے رہ جائیگی اور اس سے قبل کہ وہ آزاد حرکت کی زندگی میں داخل ہو اسے ایک تنگ راہ سے گزرنا پڑیگا۔ یہ عمل تطہیر کب تک جاری رہیگا اس کا انحصار خدا کی مرضی پر ہے "لفظ ابداً" جس کا مفہوم یہودی اور عیسائی تصوّرات کے تحت "ہمیشہ ہمیشہ" لیا گیا ہے۔ قرآنی مفہوم کے مطابق صرف وہ وقفہ مراد ہے جو پاک ہونے کے لئے درکار ہے اور جسے خداوند تعالیٰ نے خود اپنے احساس زمان اور اقدارِ اشیاء کے مطابق مقرر فرمایا ہے۔ ورنہ ہمیں ایک قسم کی "ثنویت" یا "کثرتِ ہستی" سے دوچار ہونا پڑیگا جو خدا کے برابر ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے کی صفت کا ادّعا کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال قرآنی تصورِ توحید کے منافی اور قرآن کے اس اعلان کے مغائر ہوگا جس میں کہا گیا ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۔ "جملہ اشیاء ایک دن فنا ہو جائینگے" جس میں انسان، جہنم، اور جنت ہر ایک شامل ہے۔

گناہوں سے پاک ہونے کی حقیقی صورت کے متعلق قرآن میں جو لفظ "ابدا" استعمال ہوا ہے اس کے مفہوم کی وضاحت جو ابھی پیش کی گئی ہے بہت صاف طور پر ان الفاظ سے ہو جاتی ہے جو خود قرآن نے سورۃ النبا۔ آیۃ (۲۲ و ۲۳) میں

استعمال کئے ہیں:۔ لِلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا ۝ لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا ۝" (وہی سرکشوں کا ٹھکانا (ہے) کہ اسی میں قرنوں رہینگے" ان آیات میں دوزخ کو گناہ گاروں کا ٹھکانہ قرار دیا گیا ہے جہاں وہ ایک مدت کیلئے رہیں گے۔ یہاں "احقاب" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو "حقب" کی جمع ہے۔ اس کے معنی ایک وقفہ کے ہیں جو ایک سال سے اسی سال کے درمیان ہو جس سے مجلاً ایک طویل عرصہ مراد ہے۔ اسی طرح سورۃ ہود میں (۱۰۷، ۱۰۸) کی آیتیں جہنم کی زندگی کا دوام نہیں چاہتیں۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۱

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ۱ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۝

"(بدبخت) جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہمیشہ اسی میں رہینگے مگر (اے پیغمبر) جسکو تمہارا پروردگار (نجات دینا) چاہے۔ بیشک تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔"

اور جو نیک بخت ہیں تو وہ بہشت میں ہونگے اور جب تک آسمان و زمین قائم ہیں برابر اسی میں رہینگے مگر جس کو خدا چاہے۔ یہ عطائے ربانی ہے جس کا خاتمہ نہیں۔

اِس مقام پر کہا گیا ہے کہ نیک لوگ جنت میں رہیں گے اس وقت

تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں، لیکن دوزخ کی زندگی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ خطاکار اس وقت تک اس میں رہینگے جب تک کہ زمین اور آسمان قائم ہیں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سوائے اس کے کہ تمہارا پروردگار اس کے برعکس کچھ اور چاہے، بیشک تمہارا پروردگار وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ یہ بھی غور کیجئے کہ خود دوزخ کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہیگی کیونکہ یہ زمین و آسمان کے بعد جو ایک دن فنا ہو جائیں گے برقرار نہیں رہ سکتی۔ اُوپر کی آیت پر بھی غور کیجئے۔ "اِلَّا اس کے کہ تمہارا پروردگار اس کے برعکس کچھ اور چاہے" اور باب چہارم میں "مشیت الٰہی" کی شرح کی روشنی میں اس پر نظر ڈالئے تو واضح ہوتا ہے کہ دوزخ کی زندگی انسان کیلئے اتنی ہی مدت کیلئے ہوگی جتنی کہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے درکار ہے۔ یہ حقیقت ذیل کی آیتِ قرآنی سے بھی واضح ہوتی ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ سورۃ الانعام۔ آیۃ (۱۶۱)	جو شخص نیک عمل کریگا اسکو اس کی دس نیکیاں ملیں گی۔ اور جو بدی کا ارتکاب کریگا تو اسکو اُسی قدر سزا دی جائیگی اور ان لوگوں پر مطلق ظلم نہ ہوگا۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوزخ میں کسی گناہ کے مواخذے کیلئے جو بھی آزمائش ہوگی اسکی ایک حد مقرر ہے کیونکہ گناہ کی نوعیت کے مطابق جو حد ہوسکتی ہے اس سے متجاوز ہونا یا ہمیشہ کی سزا دینا ظلم ہے۔ اور آیت متذکرہ میں یہ دعویٰ ہے کہ کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔ پھر قرآن اس کا بھی اضافہ کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ	اللہ کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا۔
ذَرَّۃٍ وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً	اگر (ذرّہ برابر کسی نے) نیکی (کی) ہو تو وہ
یُّضٰعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ	اُسے دُگنا کر دیگا۔ اور اپنے پاس سے
اَجْرًا عَظِیْمًا ○ سورۃ النساء۔ آیۃ (۴۰)	بہت بڑا اجر دیگا۔

اگرچہ قرآن نے گناہ اور اس کے عواقب کی امثالی صورت بہت ہی مہیب بنائی ہے، لیکن گناہ سے متعلق عام قرآنی رجحان ایک افسوس کا ہے جو کامل قوتِ رحم سے متبدل ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تخت پر یہ لکھ دیا ہے۔ " سبقت رحمتی من غضبی"[14] میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (بخاری کتاب التوحید) خود قرآن اس یزدانی خصوصیت کا اعلان کرتا ہے:۔

"میرا رحم ہر شئے پر محیط ہے۔"[15]

اس سے دوزخ کی ابدیت کی بحث کا ازالہ ہو جانا چاہیئے جس کی قوی حمایت مفسرین آج بھی فرماتے ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں چند احادیث پیش کئے جاتے ہیں:۔

مسلمؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں ان اشخاص کا ذکر ہے جن کیلئے قیامت کے دن کوئی شفاعت کے لئے آگے نہیں بڑھیگا اور جن کیلئے اپنے ہی لایزالی رحم و کرم کی بناء پر خود خداوند تعالیٰ شافع کی حیثیت اختیار فرمائیگا۔

"اللہ تعالیٰ اس وقت کہیگا ملائکہ انبیاء اور مومنین گناہ گاروں کی

اُس وقت شفاعت کر سکتے تھے، لیکن ان میں سے اب ایک بھی تیار نہیں ہے سوائے ارحم الراحمین کے۔ اس لئے نارِ جہنم میں سے ایک مٹھی نکالیگا اور ایسے اشخاص کو باہر کھینچ لیگا جنہوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی تھی۔"

(مسلم کتاب الجنتہ وصفاتہ)

کنزل العمال میں دو حدیثیں نقل ہوئی ہیں۔

"یقیناً دوزخ پر ایک ایسا دن آئیگا جبکہ وہ ایک ایسی کھیتی جیسی ہوگی جو ایک مدّت تک شاداب رہنے کے بعد سوکھ گئی ہو۔" "یقیناً دوزخ پر ایک دن ایسا بھی آئیگا جبکہ اس میں ایک انسان بھی باقی نہیں رہیگا۔"

(صفحہ ۲۴۵ مطبوعہ دائرۃ المعارف) حیدرآباد دکن

صحاح میں حسبِ ذیل حدیث مرقوم ہے :—

"جب اہلِ دوزخ پر کچھ مدّت گزر جائیگی اس وقت خدائے رحمٰن و رحیم اپنا ایک پاؤں اس پر رکھے گا اور دوزخ پارہ پارہ ہوکر غائب ہوجائیگی۔"

(مسلم کتاب الجنتہ وصفاتہ)

"دوزخ ہمیشہ ھل من مزید کی آرزومند ہوگی، مگر ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ خدائے بزرگ و برتر اپنا پاؤں اس میں ڈال دیگا، یہ دیکھنے کیلئے کہ آیا اسے ہنوز سیری ہوئی کہ نہیں۔ دوزخ پکارے گی بس بس میں تیری قدرت اور تیرے رحم کی پناہ مانگتی ہوں اور وہ پھر معدوم ہوجائیگی۔ جنّت کا ایک وسیع رقبہ ہمیشہ غیر آباد رہیگا۔ اللہ اسے

ایک نئے قسم کی مخلوق سے آباد کریگا جو بعد ازاں اسی میں رہیگی۔"

(بخاری کتاب التوحید)

اس طریقے کا منشاء یہ ہے کہ اہل دوزخ تطہیر کے ایک عمل کی تکمیل کرکے جنّت میں داخل ہوجائینگے۔

دوزخ کے مسئلہ سے متعلق صحابئے کرام بھی آنحضرتؐ کے اس رجحان سے واقف تھے۔ اس کا ثبوت خلیفہ حضرت عمرؓ کے ایک قول سے ملیگا۔ جو فتح البیان، فتح الباری، دُرِّ منصور اور احادالارواح (مصنفہ ابن قیمؒ) میں درج ہے۔

"اگرچہ اہل دوزخ کی تعداد ریگستان کی ریت کی طرح ناقابل شمار ہوگی لیکن ایک دن ایسا ضرور آئیگا جبکہ یہ اس سے نکال دئے جائیں گے۔" ۱۶

گناہوں کی زندگی کے متعلق قرآن کی تنبیہہ اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کی تشریح سے جو "کتاب الٰہی" کا ایک جزء ہیں ان سے ایک "حکمت" بھی وابستہ ہے۔ یہ حکمت یا مقصد واضح طور پر یہی ہے کہ انسان میں گناہ سے ڈرنے کا گہرا احساس پیدا کیا جائے۔ یہ تشریحات اس لئے ہیں کہ انسان کو گناہ سے باز رکھیں اور اس میں توبہ کا رجحان پیدا کریں اگر وہ آلودۂ گناہ ہوچکا ہو۔ توبہ کا نتیجہ بخشش ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ بار بار مغفرت کیلئے توبہ کرنیوالوں کی طرف رجوع ہونیوالا ہے۔ وہ ان پر کرم فرماتا ہے جو اسکی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسکا منشأ

یہ ہے کہ حیاتِ انسانی سے ہر اُس مزاحمت کو دور کیا جائے جو گناہ کے ذریعہ روحانی ترقی یا پاک زندگی بسر کرنے میں پیش آتی ہے۔ گناہ کی ماہیت کو محسوس کرنا اور تلافی مافات کرنا ایک سخت آزمائشی عمل ہے۔ لیکن بہتر تو یہی ہے کہ عقبیٰ کی بجائے جہاں عالمِ برزخ کی عبوری منزل میں اسے گناہ کی ہئیت کا اندازہ کرنا اور اس کی وجہ سے روح میں جو ناپاکیاں پیدا ہوگئی ہیں اُن کو جلادینا ہوگا، اس دنیا ہی میں یہ منزل طے کرنی چاہیے۔ تطہیر کا یہ عمل دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک ظہور ہے۔ یہاں ہو یا وہاں جس قدر جلد انسان توبہ کریگا دونوں حالتوں میں اتنا ہی جلد اس کے لئے بخشش کا سویرا ہوگا۔ جہنم میں ہمیشہ کی رہائش اس حکمت اور اس کے سارے مُضمرات کے مخالف پڑجاتی ہے جن کا اشارہ قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اس سے زندگی کے اس قانونِ حیات کی تردید ہوگی جس کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" تمہیں منازلِ ہستی میں درجہ بدرجہ ایک پست حالت سے بہتر حالت کی طرف لیجایا جائیگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کے رحم پر بھی حد بندی عائد ہوگی اور اللہ تعالیٰ کسی قسم کی تحدید قبول کرنے تیار نہیں۔

يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ	اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا (بیشک) اللہ سب گناہ معاف کرتا

الذُّنُوبَ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ سورۃ الزمر۔ آیۃ (۵۳)

ہے۔ وہ یقیناً بخشنے والا (اور) رحم کرنیوالا ہے

قرآن "حالت بہ حالت" آگے نئے جانے کے اصولِ ترقی کی اُن لوگوں کے لئے بار بار یاد دہانی کرتا ہے جو یہ یقین نہیں رکھتے کہ موت ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ اس غرض سے کتاب الٰہی میں انسان کو ان انتہائی موہوم حالات کی یاد دہانی کی گئی ہے جس میں اُسکی پہلی زندگی شروع ہوئی اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ جس طرح ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ تک انسان کی ترقی نمایاں رہی ہے اسی طرح موت کے بعد بھی مقامِ اعلیٰ کی طرف حرکتِ حیات جاری رہیگی۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَاراً ۝ سورۃ نوح۔ آیۃ (۱۴)

حالانکہ اُس نے تم کو مختلف طریقوں سے بتدریج بنایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَراً ۝ سورۃ الفرقان۔ آیۃ (۵۴)

اور وہی تو ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا۔

وَاللّٰهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتاً ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجاً ۝ سورۃ نوح۔ آیۃ (۱۷، ۱۸)

اور اللہ ہی نے تم کو زمین میں سے پیدا کیا جو پیدا کرنے کا حق تھا پھر اسی میں تم کو لوٹائیگا اور نکال کھڑا کریگا جو نکال کھڑا کرنے کا حق ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى ۝ سورۃ طٰہٰ۔ آیۃ (۵۵)

ہم نے تمہیں زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور ہم دوبارہ اسی میں سے تمہیں نکالیں گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي

اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے

سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

سورۃ المومنون - آیۃ (۱۲ تا ۱۶)

پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر ایک مضبوط (اور محفوظ) قرار گاہ میں رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑے کی شکل میں پیدا کیا۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا۔ پھر بوٹی کو ہڈیاں بنایا اور ہڈیوں کو گوشت پہنایا۔ پھر اُسے نئی صورت دیدی۔ تو مبارک ہے وہ اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ پھر اُس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے۔ پھر تم کو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۝ سورۃ السجدہ - آیۃ (۷ تا ۹)

اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر (مٹی کے نچوڑ) سے جو ایک حقیر پانی ہے اُس کی نسل چلائی پھر اُسے درست کیا اور اس میں اپنی رُوح پھونکی اور تم لوگوں کے لئے کان آنکھیں اور دل بنائے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اُسے یونہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیا وہ قطرہ آب نہیں تھا جو ٹپکایا گیا تھا۔ پھر خون کا لوتھڑا ہوا۔ پھر اس میں اللہ نے جان ڈالی اور اس کو درست کیا۔ پھر نر اور مادہ کی

الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ۝ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۝ سورۃ القیامہ آیۃ (۳۹-۴۰)

دو قسمیں بنائیں۔ کیا ایسا خدا مُردوں کو زندہ نہیں کر سکتا؟

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝

سورۃ انشقاق - آیۃ (۱۹)

کہ تم (منازل ہستی کو) درجہ بدرجہ طے کرو گے؟

متذکرۂ بالا قرآنی آیات اور اسی قسم کی دیگر آیتوں نے انسان کے قانونِ ارتقا اور اس کے انجام کے متعلق چند نظریوں کو اُبھارا ہے لیکن ان آیات میں جو چیز خاص طور پر جاذبِ توجہ ہوئی ہے وہ ان کا حیاتیاتی پہلو ہے۔ اس موضوع سے مسلم مفکرین کی دلچسپی کا جائزہ لیتے ہوئے سر محمد اقبال مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی کا اختیار کردہ رجحان بطورِ سند پیش کرتے ہیں۔

" یہ ایک امرِ فطری تھا اور روحِ قرآنی کے پوری طرح موافق بھی کہ مولانا روم نے لافانیت کے مسئلہ کو جس طرح چند حکماءِ اسلام سمجھتے ہیں ایک ایسا مسئلہ نہیں سمجھا جو خالص مابعد طبیعاتی بحثوں سے طے ہو سکے، بلکہ اُسے ایک حیاتیاتی ارتقا کا مسئلہ قرار دیا لیکن اس نظریۂ ارتقاء نے جدید دنیا کیلئے امید اور جوشِ زندگی کے بجائے مایوسی اور تشویش پیدا کی ہے۔ اس کی وجہ عہدِ جدید کے اس غیر واجبی مفروضہ میں ملتی ہے کہ انسان کا موجودہ سانچہ خواہ وہ ذہنی ہو یا عضویاتی، حیاتیاتی ارتقا کا حرفِ آخر ہے۔ اور یہ کہ موت بحیثیت ایک حیاتیاتی واقعہ کے کوئی تعمیری مفہوم نہیں رکھتی۔ آج کی دنیا کو پھر ایک رومی کی ضرورت ہے جو امید کا احساس پیدا کرے اور زندگی کیلئے جوش اور ولولہ کی آگ سلگائے۔ اُن کے بے نظیر اشعار یہ ہیں :-

آمدہ اول باقلیم جماد — وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیوانی فتاد — نامدش حال نباتی، ہیچ یاد
جز ہمیں میلی کہ دارد سوی آن — خاصہ در وقتِ بہار و ضیمران
ہمچو میل کودکان با مادران — سرِ میل خود نداند در لبان
باز از حیوان سوی انسانیش — می کشید آن خالقی کہ دانیش
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقلہائے اولینش یاد نیست — ہم ازیں عقلش تحول کردنیست

(دفتر چہارم اطوار و منازل خلقت آدمی از ابتدا)

رومی کا پیشکردہ تصورِ ارتقاء جسے سر محمد اقبال نے جو پیرِ رومی کے شاگرد ہونیکے مدعی ہیں سائنٹفک زبان میں ڈھالا ہے ہمارے لئے کتنی ہی دلکشی کا موجب ہو، ہمیں اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے کہ قرآن کا اصلی منشاء یہ نہیں ہے کہ ایسا کوئی ارتقائی نقشہ پیش کرے جس کی توثیق جدید سائنس کی تحقیقات سے ہو جائے۔ قرآنی اشارے ضرور جدید سائنٹفک حیاتیاتی شرح کے حامل ہیں لیکن رومی کے پیش کردہ نظریہ کی توثیق نہیں کرتے کہ انسان کو اپنے موجودہ مقامِ حیات تک پہنچنے سے قبل اُسے علی الترتیب ایک معدنی مادہ، پھر ایک نباتی اور پھر ایک حیوانی منزل سے گزرنا پڑتا اور اسی سلسلہ میں وہ اپنی موجودہ ہئیت بدل کر ایک فرشتہ کی ہئیت اختیار کریگا وغیرہ۔ بدیہی طور پر مولنا روم ابن مسکویہ (المتوفی سنہ ۴۲۱ھ) سے متاثر ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "فوز الکبیر" میں قرآنی اطلاقات سے اسی طرح متاثر ہو کر آغازِ انسانی کے متعلق ایک

ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو موجودہ سائنٹفک نقطۂ نظر کا نقشِ اوّل معلوم ہوتا ہے۔ قرآن یقیناً یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک ارتقائی عمل سے ہوئی ہے اور یہ عمل اس حالت میں بھی جاری رہیگا جسے موت کہتے ہیں۔ لیکن اس میں ایسی واضح ارتقائی منزلیں متعین نہیں کی گئیں جس طرح رومی کی پیش کی ہوئی ہیں۔

قرآن انسانی تخلیق کے ارتقائی عمل کو دو وسیع ادوار میں تقسیم کرتا ہے پہلا وہ دور ہے جبکہ انسان بتدریج تشکیل پاتا ہے اور شعور حاصل کرنے کے قابل بن جاتا ہے یا قرآنی الفاظ میں "اس میں اللہ کی روح پھونکی" جاتی ہے۔ یہ پہلا دور ہے جس کا حوالہ قرآن اس آیت میں دیتا ہے:۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا "یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں کئی منزلوں سے بنایا ہے"

سورۃ نوح۔ آیۃ (۱۴)

دوسرا دور انسان کے شکمِ مادر سے باہر آنے کے بعد شروع ہو کر اس سرحد کو عبور کرتے ہوئے جسے موت کہتے ہیں اپنا راستہ طے کرتا جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کی طرف قرآن نے اسی آیت میں اشارہ کیا ہے:۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ تمہیں یقیناً حالت بہ حالت آگے لیجایا جائیگا۔

اس سارے عمل کو ایک حیاتیاتی نوعیت دی جاسکتی ہے لیکن جس ارتقائی حالت کا قرآن خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے وہ خاص کر اخلاقی حیثیت رکھتی ہے اور جسکا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس کا مقصد اس امر پہ زور دینا ہے کہ جس طرح درجہ ادنیٰ سے درجہ اعلیٰ تک انسانی تعمیر کی ترقی واضح رہی ہے۔ اسی طرح اس کی آئندہ ترقی جاری رہے گی اور

اِس دور میں اس کی حرکت ایک شعوری حرکت ہوگی۔(نہ کہ صرف ایک بے حس حیاتیاتی تبدیلی)۔

ابتدائی دور میں جبکہ انسان حالتِ تشکیل میں رہتا ہے اس کے لئے کسی ذمہ داری کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کو اپنی تشکیلی حرکتِ ارتقا کا شعور نہیں رہتا لیکن دوسرے دور میں جوں ہی شعور کام کرنے لگتا ہے ذمّہ داری کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ اس دوسرے دور کی پہلی منزل موت کی صورت میں ختم ہوتے ہوئے بعد کی تمام منزلوں کے لئے تیاری کی بنیادی منزل کا کام دیتی ہے۔ یہ پہلی منزل ارادے اور آزادیٔ عمل کی منزل ہے یا قوانینِ حیات کیساتھ ارادی تعاون کی، جس کو فطرتِ انسانی میں رکھی ہوئی میزان کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی پیش آتا ہے اسی کا سلسلہ ہے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ "تمہاری تخلیق اور تمہارا دوبارہ اٹھنا ایک روح واحد کی طرح ہے"۔ اس منزل میں بھی آگے کی طرف کوچ کیلئے شرط یہی ہے کہ ہر تازہ اقدام کیلئے اس کی مناسبت سے شعوری کوشش ضروری ہے۔ یہ اس اقتضائے درد میں داخل و شامل ہے جو دورانِ حیات بعد الموت میں روح انسان تجلّیاتِ الٰہی کیلئے محسوس کریگی۔

رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۔ سورۃ التحریم۔ آیۃ (۸)

اے ہمارے خدا ہمارے لئے تیری روشنی مکمل کردے۔

یہ حوصلہ مند روح کی ایک سرچشمانہ دعا ہوگی۔ روشنی کی ہر تازہ قسط زندگی کی ہر اس نئی حالت کا نام ہے جو ہر تازہ موت سے رونما ہوگی۔ وہ موت جو زندگی سے ہمیشہ

ہم آغوش رہ کر ہر نئی حالت کو وجود میں لاتی ہے۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ۝ — ہم نے تمہارے درمیان موت مقرر کر دی ہے۔

سورۃ الواقعہ۔ آیۃ (۶۰)

نِ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ۝ — پاک ہے وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو ساتھ ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ یہ امتحان کرے تم میں سے عمل میں کون سب سے بہتر ہے۔

سورۃ الملک۔ آیۃ (۲)

اس ارتقائی سلسلہ حیات میں یہاں سے وہاں تک داخلی روحانی پہلو ہی بار بار نمایاں ہوتا ہے۔

یہ وہ اخلاقیاتی نقطۂ نظر ہے جس پر قرآن انسانی ہدایت کے لئے زور دینا چاہتا ہے نہ کہ حیاتیاتی پہلو پر۔ سر محمد اقبال کے پیش کردہ اشعار سے حیاتیاتی رجحان کے ظاہر ہونے کے باوجود مولانا روم نے اس اخلاقیاتی داخلی روحانی نقطۂ نظر کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس کا ثبوت حسبِ ذیل اشعار میں اسی حیاتیاتی عمل کی ایک دوسری تشریح سے ملتا ہے۔

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم بحیوان بر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کی ز مردن کم شدم
جملہ دیگر بمیرم از بشر — تا بر آرم از ملائک پر و سر
وز ملک ہم بایدم جستن ز جو — کل شیءٍ ھالک الا وجھہ
بار دیگر از ملک قربان شوم — آنچہ اندر وہم ناید آن شوم

پس عدم گردم عدم چوں ارغنون گویدم کہ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن[1]

یہاں رومی کے تصور کے مطابق ہی سہی حیاتیاتی عمل کو بھی ایک شعوری کوشش یا ایک فطرتِ اعلیٰ کی تلاش میں فطرت ادنیٰ کی قربانی پر منحصر رکھا گیا ہے۔

فطرتِ اعلیٰ کی تلاش میں کس طرح ہماری موجودہ زندگی میں فطرت ادنیٰ کو نظرانداز یا قربان کیا جائے یا ہماری اسی زندگی میں آئندہ کی زندگی کیلئے آسانی کے ساتھ حرکت کرنے کے مواقع حاصل کئے جائیں ایک ایسا مسئلہ ہے جو غور و فکر کیلئے اس وقت ہمارے درپیش ہوتا ہے۔ اس کا جواب قرآن نے پہلے ہی دیدیا ہے کہ :- "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ" لیکن حیات مابعد کے تصور کے پیش نظر عمل صالح کی نوعیت کیا قرار پائیگی؟

یاد ہوگا کہ قرآن نے انسان کو "زمین پر اللہ کا نائب قرار دیا ہے" واضح ہو کہ یہ اصطلاح اس کی مابعد کی زندگی کے متعلق نہ استعمال کی گئی ہے نہ دہرائی گئی ہے۔ اسکی وجہ صاف ہے۔ توحید الٰہی پر اور وقتاً فوقتاً اس کے رسولوں کے ذریعہ بھیجے ہوئے پیام کی صداقت پر ایمان انسانی اتحاد یا اس کے لئے ایک پُرامن نظام زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ منصب خلافت کا مفہوم اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کا تعلق اسی مقصد خاص سے ہو۔ یہ منصب موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد کی زندگی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس کے عمل کیلئے وہاں کوئی سماجی، معاشی یا سیاسی پس منظر نہیں رہتا۔ وہاں خداوند تعالیٰ کو انکشاف کے ذریعہ یا پردے کے پیچھے سے یا کسی رسول کے ذریعہ انسان سے مخاطب ہونے کی ضرورت

باقی نہیں رہتی جیسا کہ سورۃ الشوریٰ آیۃ (۱۵) میں ہے۔ اس کے برعکس انسان حقیقت کے روبرو آجاتا ہے اور اس روشنی کی رہبری میں جو اس کی اپنی زندگی کے صلہ میں حاصل ہوگی اپنا راستہ آپ نکالتا ہے۔ وہاں نہ تو دولت کام آئے گی اور نہ قوت، نہ وہاں جمہوریتوں یا پارلیمانوں یا انتخابات یا تحفظ عالم کی تجویزوں کا ذکر ہوگا۔ اس دنیا کے ان زبردست مقتدر و ذی شان لوگوں کو جنہوں نے غیر صالح زندگی بسر کی ہوگی۔ اپنے ان غلاموں کیلئے راہ ترقی سے ہٹ جانا ہوگا جنہوں نے نیک زندگی بسر کی ہوگی۔ قرآن فرماتا ہے:۔ وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ سورۃ بنی اسرائیل۔ آیۃ (۷۲) "اور جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہیگا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا" یہی وہ راستہ ہے جس کیلئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن کی یہ خواہش ہے کہ انسان اسی دنیا میں اس راستے پر قدم رکھے تاکہ دوسری دنیا میں خوبی اور آزادی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھ سکے قرآن کا بیان ہے:۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۝ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ سورۃ العنکبوت۔ آیۃ (۶۴)

اس دنیا کی زندگی جذبات کا ایک کھیل ہے اور حقیقی زندگی تو دوسری دنیا کی ہے۔

اس حقیقی زندگی کو اسی دنیا میں شروع کرنا ہوگا۔

"حقیقی زندگی" کی خصوصیت یہ ہوگی کہ تکمیل حیات کا راستہ چلنے والا نور اور

زیادہ نور کیلئے بے قرار رہیگا۔ اس کی ہمیشہ دعا قرآن کے مطابق یہ ہوگی :۔
"اے پروردگار ہمارے لئے نور کمل کردے" وہ نور جو اُسے حقیقت کے حضور پہنچادے یا قرآنی الفاظ میں "وجہ اللہ" یا وہ روشنی جو زمین و آسمان کا نور ہے اسے دکھادے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا	نور کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک طاق ہے
مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ	جس میں ایک چراغ ہے اور چراغ ایک شیشہ
اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ	میں ہے شیشہ ایسا ہے گویا ایک روشن ستارہ
دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ	ہے۔ اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا
مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ	جاتا ہے یعنی زیتون جو نہ شرقی جانب ہے اور نہ غربی
وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا	جانب۔ اس کا تیل خود بخود جل اُٹھنے کو ہے
يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ	خواہ اُسے آگ بھی نہ چھوئے، روشنی پر روشنی
نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ	ہو رہی۔ اللہ اپنے اس نور تک جسکو چاہتا ہے
لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ	رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کیلئے مثالیں بیان
اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ	کرتا ہے اور اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ سورۃ النور۔ آیۃ (۳۵)

اس نور کی خواہش اسی دنیا میں شروع ہو جانی چاہیئے۔ یہ اُن لوگوں کیلئے ممکن ہوگا جو ہر موقع پر "حضورِ قلب" یا "قربِ الٰہی" کا احساس رکھیں گے۔ ایک

عالم کیف و سرور میں رسولِ خدا نے یہ دعا فرمائی تھی:۔

اللھم اجعل فی قلبی نوراً و فی بصری نوراً و فی سمعی نوراً و عن یمینی نوراً و عن شمالی نوراً و من امامی نوراً و من خلفی نوراً واجعل لی نوراً و فی عصبی نوراً و فی لحمی نوراً و فی دمی نوراً و فی شعری نوراً و فی بشری نوراً و فی لسانی نوراً و اجعل فی نفسی نوراً و اعظم لی نوراً و اجعلنی نوراً و اجعل من فوق نوراً و من تحتی نوراً اللھم اعطنی نوراً۔

اے اللہ! بھر دے میرے دل میں نور اور بھر دے میری آنکھوں میں نور اور بھر دے میرے کانوں میں نور اور ڈال دے میرے سیدھے جانب نور اور بائیں جانب نور اور ڈال دے میرے آگے نور اور پیچھے نور اور دے مجھکو نور اور میرے اعصاب میں نور بھر دے اور میرے گوشت میں نور بھر دے اور میرے خون میں نور بھر دے اور سا دے میرے بالوں میں نور اور میرے پوست میں نور اور میری زبان میں نور دے اور میرے نفس میں نور بھر دے اور میرے لئے نور میں اضافہ کر اور مجھے خود نور بنادے اور مجھے نور سے گھیر دے اے اللہ۔ مجھے عطا کر نور ہی نور۔ ۱۸

امنوا وعملوا الصالحات کا حکم اس شخص کیلئے جو اپنے ہر تاثیر اور عمل میں احساس الٰہی رکھتا ہے ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ خدا کے اس احساس سے اُن لوگوں میں جو کسی کام کو یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ اسے کرنا ہے، یا اُن پر فرض ہے، یا اس سے اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے، یا دنیوی پریشانیاں دور ہوتی ہیں اور اُن لوگوں میں جو کسی نیک عمل کو یہ سمجھکر نہیں کرتے کہ اس کا صلہ ملیگا بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ نیک کام فی نفسہٖ نیک ہے۔ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اور اس خیال سے انہیں سکون قلب حاصل ہوتا ہے نمایاں فرق رہ جاتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو اُس حبشی لڑکے کو جس کا تعارف ہمارے ابتدائی باب میں ہو چکا ہے، نمایاں طور پر حاصل تھا اور اسی احساس کا پیدا کرنا ہر اس انسان کے لئے ضروری ہے جو اپنی زندگی کی دوسری منزل میں حالت بہ حالت آگے بڑھنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس نوع کے مرد اور عورتوں کو جنت سے کوئی دوامی دلچسپی نہیں ہوتی۔ بغداد کے شیخ اعظم حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح وہ یہ حوصلہ رکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اسے پیچھے چھوڑ دیں اور زیادہ تجلی اور زیادہ تکمیل کے لئے اپنے قدم آگے بڑھاتے جائیں۔ ۱۹

لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے اس خاکی ماحول ہی میں اس قسم کی حیاتِ مابعد جو "حقیقی زندگی" ہے بسر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کے مطابق کوئی زندگی زندگی ہی نہیں جو اس نوعیت کی نہ ہو اور یہ اس وقت

تک ممکن نہیں جب تک کوئی فرد کبھی نہ کسی مقدار میں اس احساس الٰہی کو فروغ نہ دے جس کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو ایک تناسب کے ساتھ اسی قدر ترقی کرتا ہے جس قدر کہ وہ احساسِ خودی کو اپنے قابو میں رکھتا ہے یا اُسے اِس اِحساسِ الٰہی کے تابع کر دیتا ہے۔

عام بنی نوع اِنسان کیلئے قرآن نے عمل کا معیار یہ قرار نہیں دیا ہے کہ وہ اپنے احساسِ خودی کو کاملاً خارج کر دیں۔ یہ اقتضائے دروں صرف اسی قسم کے ذہنوں کا ہے جو اپنی مسرت کیلئے خدا میں "جذب کامل" چاہتے ہیں یا صوفیانہ اِصطلاح میں "فنا فی اللہ" ہونا چاہتے ہیں۔ اِس قسم کے باطنی تقاضے کے حق سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن خدا میں جذب ہونے کا تجربہ جو صوفیانہ ہوتا ہے انسانی معاشرہ کے لئے اسی حد تک مفید ہے جس حد تک وہ ایک ایسے تصور میں ڈھل جائے جس کی قدر و قیمت جس طرح پچھلے باب میں بتلائی گئی ہے انسان کیلئے سماجی یا روحانی افادیت کی ہو۔ قرآن انسان کو جس چیز کے حاصل کرنے کی خواہش یا تلقین کرتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اِحساسِ خودی کو کاملاً فراموش کر جائے، بلکہ اس کو اپنے داخلی احساسِ رب کے ساتھ مربوط کر دے یا دونوں میں ایک توازن برقرار رکھے۔ اس کا نام تقویٰ یا متوازی زندگی ہے۔ یہ صفت اس ذہن کی ہے جو قرآن تشکیل دینا چاہتا ہے، وہ ذہن جو زندگی کو خدا کا ایک عطیہ اور ایک مقدس امانت سمجھتا ہے جس کے ذریعہ وہ ہر آن "وجہ اللہ" کے حضور میں رہ سکے۔ اور جو اس سے ظہور میں آنے والی تجلیوں سے ہدایت پاکر خود سراپا نور ہو جائے تاکہ اندھیرے میں جدوجہد کرنیوالوں کیلئے ایک مشعلِ ہدایت بن سکے۔

اُمّۃً وّسطاً

گذشتہ صفحات میں اس ذہن پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی سعی کی گئی تھی جس کی تعمیر کرنا قرآن مجید کا منشاء ہے۔ ایسا ذہن جو دنیا کو اپنے صالحین و متقین و مقسطین و مفلحین اور اپنے صادقین و صدیقین اور اس سلسلہ کی دیگر ہستیاں دیا کرتا ہے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور جو اس احساس ذاتِ باری کے شعور کامل کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں، جو اُن میں ترقی پا چکا ہے۔ اس قسم کے ڈھلے ہوئے ذہن رکھنے والے افراد کی جماعت یعنے اصحاب رسول اللہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کو قرآن نے امۃً وسطاً کا لقب عطا کیا ہے یعنی وہ جماعت جو "وسط زرین" کا مقام رکھتی ہے، ایک متوازی زندگی بسر کی ہو اور جو دوسروں کیلئے ایک مثال بنتی ہو جس طرح کہ رسول اللہ اُن کے لئے مثال تھے۔ یہ اصطلاح اس کردار کی نوعیت کی شرح کرتی ہے جو اجتماعی سطح پر ذہن انسان کو حاصل کرنی ہے۔

یہ وہ امۃً وسطاً تھی جسے رسول خدا نے ایک مملکت کی صورت عطا فرمائی جو اسلام کی اولین مملکت تھی اور یہ ایسی تنظیم تھی جو آگے چل کر ایک عالمی

تنظیم کا مرکز یا نقطۂ آغاز بن سکتی تھی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے اپنی امت کو ایک مملکت کے سانچے میں ڈھالا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو صرف اتنا وقت مل سکا کہ اس کی بنیاد رکھ سکیں اور عمارت تیار کرنے کا کام آنے والوں کیلئے چھوڑ دیں۔ آپکا اساسی اور فوری منشا تو یہ تھا کہ فرد کی شخصیت کو ابھاریں اور اس میں ایسی صلاحیتیں پیدا کریں کہ وہ اپنے آپ سے امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکے اور اسی طرح خارجی دنیا کے ساتھ بھی۔ آپ نے یہ کام اس یقین کامل کے ساتھ فرمایا کہ صحیح نمونے کے مرد و عورت جب پیدا ہونگے تو ان کی منظم و متحد زندگی کے قابل ایک سیاسی تنظیم لازماً صحیح خطوط پر اُبھر آہی جائے گی۔

مملکت کی تخلیق اور ابتدائی نشوونما کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کسی طرح آسان نہیں ہے کہ ہم اس مملکت کو تاریخ میں پیدا شدہ اقسام حکومت میں سے کسی ایک نام سے موسوم کرسکیں۔ وہ یقیناً ایک مذہبی پیشواؤں کی مملکت نہیں تھی، کیونکہ یہاں مذہبی پیشواؤں کی کوئی ایسی جماعت وجود میں نہیں لائی گئی جو خدا کی براہ راست ہدایت کے ساتھ سیاسی اقتدار استعمال کرتی ہو۔ ایسی جماعت جو خصوصاً بنی اسرائیل میں ایک زمانہ تک برسر کار رہی۔ قرآن کسی قسم کی سیاسی پا دریت کو روا رکھ ہی نہیں سکتا۔ پیغمبر کی چھوڑی ہوئی اس نوخیز مملکت نے خلفائے راشدین کے اوّلین عہد حکومت میں چند ایسے خصائص پیدا کرلئے جو میدان عمل میں مکمل سیاسی اور معاشی جمہوریت کی عکاسی کرتے تھے لیکن اس نے اپنے جمہوری طرز حکومت کے نظریاتی طریق فکر میں موجودہ جمہوریت کے اُس بنیادی

اصول کو قبول نہیں کیا کہ مملکت کا اقتدار اعلیٰ عوام میں مرکوز ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے کہ سارا اقتدار خدا اور صرف خدا کو ہی حاصل ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کی نئی مملکت کو پادشاہت سے بھی موسوم نہیں کیا جاسکتا تھا چہ جائے کہ اُسے آمریت کہا جائے کیونکہ نہ تو رسول اللہ نے نہ خلفائے راشدین نے اپنے لئے وہ لقب پسند کیا جو خداوند تعالیٰ کیلئے مخصوص تھا اور نہ کوئی آمرانہ حق طلب فرمایا رسول اللہ کو صرف یہ کرنا تھا کہ وقتاً فوقتاً جو وحی رشد و ہدایت کی ملتی رہی اُسکے مطابق عمل کریں یا اپنے اصحاب کے مشورے سے جو راہ نکل آئے اختیار کریں خلفائے راشدین نے بھی یہی روش اختیار کی۔ اگرچہ کہ نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے جن کے متعلق کوئی خاص قرآنی ہدایت تھی اور نہ رسول اللہ کا عمل۔ انہوں نے قرآن کی دوسری تدبیر یعنی "مشاورت باہمی" کے اصول کو آزادی کے ساتھ اختیار کیا۔ اس طریقہ کو "اجتہاد" کہتے ہیں۔ جن اصحاب سے انہوں نے مشورہ کیا وہ ممتاز تجربہ کار لوگ تھے۔ انہیں اجماع یعنی عوام کا اعتماد حاصل تھا اور یہ "شوریٰ" کہلاتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی مملکت کو جس کا مقصد جمہوری طریقوں پر قانون کا اقتدار جس کا اساسی جُز خود قرآن نافذ کرتا ہے اور جو ایمائے ربانی سمجھا جاتا ہے قائم کرنا تھا کس نام سے موسوم کیا جائے؟ اس کا جواب اُس مقصد میں ملیگا جو اساسی قوانین الٰہی کی تہ میں کارفرما ہے۔ وہ یہی تھا کہ وہ امت یا مسلم جماعت کی اجتماعی زندگی کیلئے ایک واضح ثقافتی پس منظر پیش کرے یا

اُس میں ایک روحانی زندگی پیدا کرے۔ اسی پس منظر کی روشنی میں مملکت کے جملہ امور کو طے کرنا ضروری تھا۔ وہ بھی کسی مذہبی پیشواؤں کے محکمہ کے ذریعے نہیں بلکہ مشاورت باہمی کے ذریعہ۔ اس طرح اس نئی مملکت کا چہرہ یقیناً جمہوری تھا لیکن اپنے نقطۂ نظر اور ذمہ داری میں ان پچھلے نمونوں سے مختلف تھا جو یونانی اور رومی تھے اور جو صرف خاص گروہوں کے مفاد کی خاطر تشکیل پائے تھے مثلاً یونان کی جمہوریت میں جو "آواز جمہور" کہلاتی تھی اسکا بدل یہاں "اجماع" یا کثرتِ آرا تھا۔ اِن دونوں میں جو فرق ہے وہ اس ذمہ داری کے احساس میں پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ عوام کی آواز پر عمل ہوتا تھا اور مملکت کے کاروبار چلائے جاتے تھے۔ اس جمہوری مملکت کے عوام کی ذمہ داری جو کسی امر انتظامی میں اپنی منظوری دیتے تھے بےشک اہل یونان کی طرح انہیں پر منحصر تھی، لیکن یہ ضروری تھا کہ اس میں اُس بزرگ و برتر قوت یعنی خدائے تعالیٰ کے سامنے جو مالکِ حقیقی ہے کامل جواب دہی اور ذمہ داری کا احساس اور ہدایت بھی شامل ہو۔ یہی احساس ہر ایک کیلئے واجب تھا خواہ وہ خود خلیفہ ہو، یا مجلسِ شوریٰ ہو یا کوئی عہدہ دار جو خلیفہ کی طرف سے مقرر کیا جاتا۔

اس طرح عرب کا نیا جمہوریہ خدا سے ڈرنے والے افراد کا جمہوریہ تھا اور اس کا انتظام قرآن کے نظریۂ عدل واحسان کے مطابق صالحین کی وہ جماعت کرتی تھی جو مشہور، ممتاز اور راست باز انسانوں پر مشتمل ہوتی تھی اور جو ہر شہری کو ایک صالح زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کرتی تھی محض اس

بناء پر کہ اس جمہوری زندگی کا پس منظر مذہب اور اسکی تعلیمات سے متعلق کیا جاسکتا ہے اسے ایک مذہبی مملکت یا مذہبی پیشواؤں کی حکومت قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی مملکت خواہ وہ کتنی ہی "سیکولر" یا معاملاتی ہو اپنے عمل میں کسی نہ کسی روحانی یا اخلاقی پس منظر کے بغیر قائم رہ ہی نہیں سکتی ۔ واضح طور پر اتنا فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ پس منظر ایک چیز ہے اور اس کے اصولوں کو روبہ عمل لانا دوسری چیز ہے۔ یہ دوسری چیز یقیناً معاملاتی حیثیت رکھتی ہے لیکن اول الذکر کا مقصد یہ ہے کہ وہ معاملات میں ایک ثقافتی اور اخلاقی جوہر پیدا کرے۔ یہ فرق زندگی کے اس قرآنی نقطہ نظر میں مضمر ہے جو اس کے عمل کو حقوق اللہ اور حقوق الناس یا حقوق العباد میں تقسیم کرتا ہے۔ حقوق اللہ مثلاً عقائد، عبادت، قلب و جسم کی صفائی، اولاً فرد کی شخصی ذمہ داریاں ہیں جن کی جوابدہی بالراست اللہ ہی سے متعلق ہے۔ اِلّا اس کے کہ عام طور پر اس کا لحاظ نہ رکھنے سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہو۔ اسکی بجائے حقوق الناس، یا سماجی ملحوظات مملکت کے دائرہ عمل میں آتے ہیں۔ یہ زیادہ تر معاملاتی اُمور انسان اور انسان کے درمیان تعلقات سے سروکار رکھتے ہیں اور یہ لازماً معاملاتی طریقہ انتظام سے سرانجام پاتے ہیں۔ خلفائے راشدین نے یہ دیکھ کر کہ امت کو ابھی عبوری دور سے گزرنا ہے حقوق اللہ کی پابندی پر ایک قسم کی سرپرستانہ نظر رکھی اور جس وقت ضرورت ہوئی نئے حالات مطابقت پیدا کرنے کیلئے اپنے رفقاء کے مشورے سے ان کی تشریح کی۔ لیکن

اِس طریقہ عمل سے ان کا عہدِ امت کے روحانی سردار کا نہیں بن گیا۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کی پابندی پر خلیفہ بھی ایسے ہی مکلف تھے جس طرح جماعت کے دوسرے افراد۔ ایک کے عمل کا اثر اور عکس دوسرے کے عمل میں نظر آسکتا تھا۔

ملاحظہ ہو کہ نئی مملکت کی خلافت قبول فرماتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہدہ کو کس نظر سے دیکھا۔ آپ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں فرمایا:-

"میرے ساتھیو! میں خدا کو گواہ رکھتا ہوں، مجھے اس عہدے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ نہ میں نے اس کو حاصل کرنے کی خواہش کی، نہ میں نے چھپ کر نہ ظاہری طور پر اس کے لئے کوئی دعا مانگی۔ میں نے یہ عہدہ صرف اس لئے قبول کیا ہے کہ کہیں فتنہ و فساد سر نہ اٹھائے ورنہ قیادت و رہبری میں کوئی مسرت نہیں ہے۔ اس کے برعکس جو بوجھ میرے شانوں پر ڈالا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں اُسے برداشت کرنے کی مجھ میں ذاتی طاقت نہیں ہے۔ میں سوائے امانت ایزدی کے اس منصب کو پورا نہیں کر سکتا۔ گو میں آپ پر کسی طرح فوقیت نہیں رکھتا مگر آپ نے مجھے اپنا قائد بنایا ہے۔ اگر میں برحق رہوں تو میرے ساتھ تعاون کرنا۔ اگر غلطی کروں تو اسکی صحت کرنا جب تک میں خدا اور رسول کے احکام کی اتباع کروں میرا ساتھ دینا اور اگر منحرف ہو جاؤں تو مجھ سے منہ پھیر لینا۔"

اپنے قلب میں ہر آن قائم رہنے والے احساس خداوندی کے فیضان کے ساتھ خلیفہ اوّل نے جس کوشش کا یہاں وعدہ فرمایا ہے وہ اپنی نئی مملکت کو

صحیح جمہوری قالب میں ڈھالنے کا دعدہ تھا۔لیکن خلافت پر فائز ہونے کے تیسرے ہی سال آپکا انتقال ہوگیا۔آپ کے اس منصب خلافت کو حضرت عمرؓ نے سنبھالا اور توانائی کے ساتھ جاری رکھا۔لیکن اس تجربہ کی تکمیل کے لئے آپ کی عمر نے بھی وفا نہ کی۔خلافت کے دسویں سال ہی میں ایک ایرانی بدیسی نے آپکو قتل کردیا۔آپ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے۔لیکن یہ بھی غالباً اس زمانے کی رقابتوں کی زد میں آکریکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔یہی چار خلفاء ہیں جنہیں "راشدین" یعنی صحیح ہدایت یافتہ سے خطاب کیا جاتا ہے۔ ان کی خلافت کا زمانہ تیس سال سے زیادہ پر محتوی نہیں ہے۔یہی وہ عہد ہے جسے ہم اسلامی سیاست میں جمہوری تجربہ کا عہد کہہ سکتے ہیں۔اس میں جو روح کارفرما تھی وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عروج کو پہنچی اور حضرت علیؓ کی شہادت میں گم ہوگئی۔

اسلامی مملکت کو خلفائے راشدین عوام کی مملکت سمجھتے تھے اور جس حیثیت اسکی یہ عوام ہی کی فلاح وبہبود کیلئے چلائی گئی تھی۔کسی شخص کو ذاتی طور پر کوئی خاص مراعات حاصل نہ تھیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خلیفہ کو برابر کے لوگوں پر اولیت حاصل تھی۔مساوات کی مثال یہ ہے کہ جب مدینہ میں غذا اور لباس کی راشننگ ہوئی تو خلیفہ کو بھی ایک عام شہری کی طرح صرف اس کا مقررہ حصہ ملا۔امور مملکت سے متعلق کسی مسئلہ میں بھی ہر مرد اور عورت کو استفسار کا پورا پورا حق حاصل تھا۔کوئی شخص ایسا نہ تھا جو قانون سے بالاتر ہو۔

حضرت عمرؓ کو خود اپنے معمور کردہ قاضی کے سامنے ایک معاملہ میں جواب دہی کیلئے پیش ہونا پڑا - اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے مقابلہ میں استغاثہ پیش کیا اور فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا - قرآن نے زندگی کے جو معاشی اصول بنائے تھے اور جس میں زور دیا گیا تھا کہ غریبوں کی امداد کیلئے متمول افراد کی آمدنی کا کچھ حصہ مختص کیا جائے - ان پر مملکت میں بڑی دیانت کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا - مملکت کا خزانہ عوام کا خزانہ تصور کیا جاتا تھا اور اگر ختم سال پر کچھ رقم خزانہ میں بچ رہتی تو وہ بطور وظیفہ ضروریات کے مطابق عوام ہی میں تقسیم ہوتی تھی اور اس طرح عوام کی رقم عوام ہی کو لوٹا دی جاتی تھی - وہ قرآنی احکام جو عورتوں کی حیثیت کو آزاد معاشی عناصر قرار دیتے ہیں اور جن کی رو سے وہ اپنے مال کو اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا حق رکھتی ہیں - وہ نہایت احترام و احتیاط کے ساتھ روبہ عمل لائے جاتے تھے -

جان و مال کا تحفظ اور آزادیٔ ضمیر کی ضمانت اُن غیر مسلموں کی دی جاتی تھی جنہیں "ذمی" یعنی "خدا اور رسول کی حفاظت میں رہنے والے" کہا جاتا تھا پیغمبر خدا نے اعلان فرمایا تھا کہ "خبردار قیامت کے دن میں خود اس شخص کے خلاف دعویدار ہونگا جو کسی "ذمّی" کو ستاتا ہے یا اُس پر ایسی ذمہ داری رکھتا ہے جو اس کے بس کی نہ ہو یا اس شئے سے محروم کرتا ہے جو اسکی ملک ہو"[2] - آپ کو اُن کی فلاح و بہبود کا واقعی اتنا خیال تھا کہ وصال سے کچھ پہلے آپ کو ذمّی کا خیال آگیا - آپ نے فرمایا: "وہ شخص جو کسی ذمّی کو قتل کرے جنت کی

شمہ برابر بوا بھی کھانے کا مستحق نہ ہوگا۔ ان کی حفاظت کرو۔ وہ میرے ذمّی ہیں۔" حضرت عمرؓ جب تلوار کھا کر زخمی ہوئے تو ایسی ہی ساعت میں انہیں بھی ذمّی یاد آئے تو آپ نے فرمایا " اس شخص کو جو میرے بعد خلیفہ ہوگا میں اپنی یہ آرزو اور وصیت سونپتا ہوں۔ ذمّی خدا اور رسول کی حفظ و امان میں ہیں۔ اُن معاہدوں کا احترام کرو جو اُن سے کئے گئے ہیں اور جب ضرورت ہو ان کے مفاد کے لئے لڑو اور ان پر ایسا بار اور ذمہ داری نہ ڈالو جسے وہ برداشت نہ کر سکیں۔"

سر تھامس آرنلڈ اپنی کتاب "تبلیغ اسلام" میں بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیت المقدس فتح ہوا تو حسب ذیل شرائط مرتب ہوئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - میں عمر خدا کا ایک بندہ امیر المومنین۔ بیت المقدس کے عوام کیلئے حسب ذیل معاہدات منظور کرتا ہوں۔ "میں انہیں ضمانت دیتا ہوں ان کے جان و مال کی حفاظت کی انکے بچوں، عبادت گاہوں، ان کے صلیبوں کی اور ہر اس چیز کی جن سے انکی جان کی حفاظت ہو۔ ان کی زمین کی اور سب کو اُن کے مذہب کی۔ ان کی عبادت گاہوں کو نہ کمزور کیا جائیگا، نہ برباد کیا جائیگا، اور نہ کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کے اوقاف کو، نہ ان کی شان اور مرتبے کو۔ نہ ان کی ملکیت کی کسی شئے کو، اور نہ بیت المقدس کے باشندوں پر اپنی مذہبی پابندیوں کی وجہ سے کوئی تشدد روا ہوگا۔

نہ اُن میں سے کسی کو اذیت پہنچائی جائے گی۔ ۵

پھر آرنلڈ یہ لکھتے ہیں :-

"بطرق کی معیت میں حضرت عمرؓ نے مقامات مقدسہ کی زیارت کی،
اور کہا جاتا ہے کہ جب عیسائیوں کی سب سے مشہور گرجا میں پہنچے تو نماز
کا وقت آچکا تھا۔ بطرق نے حضرت عمرؓ سے نماز ادا فرمانے کیلئے کہا
لیکن آپ نے کچھ غور کے بعد یہ کہہ کر انکار فرمایا کہ اگر آپ ایسا
کرینگے تو آپ کے تابعین آگے چل کر اسے اپنی عبادت گاہ قرار دینگے۔ ۶

عمل کے دوسرے دائروں کی طرح حالت جنگ میں بھی خلفائے راشدین نے
کبھی انسان دوست رجحانات کو جن کا حکم قرآن نے دیا تھا نظر سے دور نہیں کیا۔
آرنلڈ کہتے ہیں کہ "فاتحین کے ایسے ضبطِ نفس اور انسانیت کی وجہ سے جو
انہوں نے اپنی فتوحات میں دکھائی۔ ان کے اس لشکر کی بڑی تعظیم کی گئی ہوگی
اور اسے خوش آمدید کہا گیا ہوگا۔ جو انصاف اور اعتدال کے اُن اصولوں پہ
عمل پیرا تھا جن کو حضرت ابو بکرؓ خلیفہ اول نے شام کی مہم کے وقت مقرر فرمایا تھا۔

"انصاف پر قائم رہو، اپنے عہد و پیمان کو نہ توڑو، کسی جسمانی عضو کو
نہ کاٹو، بچوں کو قتل نہ کرو اور نہ عورتوں اور بوڑھوں کو، کھجور
کے درخت کو نقصان نہ پہنچاؤ! اور نہ انہیں جلاؤ اور نہ ثمر دار درختوں
کو کاٹو۔ مویشیوں، گلوں اور اونٹوں کو غذا حاصل کرنے کے سوائے
ذبح نہ کرو۔ شاید تمہیں ایسے بھی لوگ ملیں جو خانقاہوں میں

گوشہ نشین ہوگئے ہوں، انہیں امن کے ساتھ ان کے حال پر چھوڑ دو۔

راشدین کی اس جمہوریت کو جو تاریخ انسانی کے تاریک دور میں ایک مثالی مملکت کی صفات کا مظہر تھی، اگر مسلسل آزاد زندگی ملتی تو یقیناً رسول خدا کے تصور کے مطابق ایک عالمی وفاق کی صورت اختیار کرتی جس کا ہر رکن دوسرے کیلئے "کا۔ بان" ہوتا لیکن یہ ہونا نہ تھا! اسلام کا حزنیہ یہ ہے کہ یہ نوزائیدہ نازک پودا پھلنے پھولنے ہی نہ پایا۔ وصال نبوی کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کے پیروں ہی کے ہاتھوں اسکا استیصال ہوگیا اور اسلام کے نام پر مختلف قسم کی مطلق العنانی میں بدل گیا۔ لیکن مدت خواہ کتنی ہی کم ہو جبتک یہ جمہوریت قائم رہی کم از کم اپنی روشن ساعتوں میں اس نے امتہً وسطاً کی طرح باشعور طریقے پر کام کیا۔

دور جدید کے علماء عہد نبوی کو "حکومت الٰہیہ" قرار دیتے ہوئے اس کا اطلاق عہد راشدین پر بھی کرتے ہیں، اگرچہ راشدین کے زمانے کے حالات وہ نہ تھے جو عہد نبوی کے تھے۔ یہ علماء ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔ چونکہ راشدین اصحاب رسول تھے اور شخصی طور پر یا بلاواسطہ جس طرح ان کو علم تھا وہ سنت نبوی کی روشنی میں ان احکام کی تعمیل کرتے تھے جو قرآن نے دئیے تھے اس لئے اسلام کے اساسی قانون تک اُنکی رسائی اُسی انداز کی تھی۔ لیکن ہمارے علماء اِس اصطلاح کو اس نظام پر بھی منطبق کرتے ہیں جو دوسری اور تیسری صدی ہجری کے فقہاء نے اپنے زمانے کی مروجہ روایات و تشریحات

احکامِ قرآنی کی روشنی میں مرتب کیا تھا۔ اس نوع کے نظام یا قانون کو "فقہ" کہتے ہیں اور یہ مختلف مذاہب میں منقسم ہے جن میں سے ہر ایک عند عمل تک اسلام کا قطعی اور حتمی قانون بنا ہوا ہے۔ اس قانون کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ یہ کئی صورتوں میں نتیجہ ہے "اجتہاد" کا جو اس کے واضعین نے اختیار کیا لیکن اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ جو لوگ بعد کو آئیں وہ اپنے لئے اس حق اجتہاد کو استعمال نہیں کر سکیں گے۔ حالانکہ قرآن کا اساسی حکم یہ ہے کہ اپنے معاملات میں "مشاورت کرو" اور یہ حکم کسی خاص زمانے سے مختص نہیں کیا گیا۔ زندگی کے اہم معاملات میں تو یہی انداز فکر رہا ہے۔ یہ فقہ جسے شریعت بھی کہتے ہیں اور جسے قرونِ وسطیٰ کے فقہاء نے اپنے زمانے کے ماحول کو سامنے رکھ کر وضع کیا تھا۔ ہمارے علماء کے نزدیک ابدی قانون اسلام ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلم مملکت اس کا احیاء کرے اور من وعن عہدِ حاضر میں اُسے نافذ کرے۔ چونکہ خدا کسی مرئی صورت میں انسان کے آگے اس کے کاروبار میں حصہ لینے نہیں آتا۔ اس لئے علماء اس احیائی صورت میں حکومتِ الٰہی سے یہ مراد لینا چاہتے ہیں کہ انتظام مملکت میں ان کی آواز فیصلہ کن قرار دی جائے کیونکہ یہ اپنے آپ کو شریعت یا قانونِ الٰہی کے ٹھیکہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کی حکومت تو صرف ایک گروہ خاص کی حکومت ہوگی جس طرح دورِ اسرائیلہ میں علماء بنی اسرائیل کی تھی اور جو قرآنی رُوح اور منشاء کے صریحاً منافی ہے۔ اِس خیال سے کہ ایک طرف مذہبی پیشواؤں کو

بھی ناخوش نہ رکھا جائے اور دوسری طرف دورِ جدید کے جمہوری تصور سے
بھی انحراف نہ کیا جائے، عالمِ اسلام کے بعض حصّوں میں ایک درمیانی راستہ
یہ نکالا جا رہا ہے کہ راشدین کی جمہوری طرزِ حکومت کا احیار کیا جائے لیکن
کیا یہ اس وقت تک ممکن ہے جب تک کہ عہدِ راشدین کی فضار کا بھی احیا
نہ ہو جس کو غائب ہو کر زمانہ گزرا اور جس کی فضا، ہی میں راشدی طرزِ حکومت
پھل پھول سکے گی ؟ اگر یہ ممکن بھی ہو تو کیا یہ آجکل کی فضار کے سانچوں میں
ٹھیک بیٹھ سکیگی ؟ اس کے معنی یہ ہونگے کہ زندگی کو تیرہ سو سال پیچھے دھکیل
دیا جائے اور ہم دنیا سے منقطع ہو کر رہ جائیں جو ظاہر ہے کہ قطعاً ناممکن ہے۔
اس کے قطع نظر یہ بھی یاد رہے کہ راشدین اور ان کے مشیر وہ لوگ تھے
جنہوں نے رسولِ خدا کے ساتھ زندگی بسر کی تھی اور سنت یا اس روحِ عمل
سے واقف تھے جس کے ذریعہ حضور اپنی امت کے امور زندگی کا انصرام
فرماتے اور جن کو آپؐ نے امتہٗ وسطاً کی صفات سے متصف فرمایا تھا لیکن
اب اتنے عرصہ کے بعد اس کا صحیح علم کس طرح حاصل ہو سکتا ہے یا اس کی
واضح تصویر کس طرح نظر آسکتی ہے جب تک کہ قرونِ وسطیٰ کا وہ غلاف نہ
اٹھایا جائے جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کیا ہم اپنے ذہن
سے وہ سب کچھ محو کر دینے آمادہ ہیں جو غیر قرآنی ہے اور جو اسکی خانہ جنگیوں
اسکی مذہبی فرقہ بندیوں ۔اس کی مطلق العنانی اور جاگیریت اور دیگر داغہائے
نمایاں کے ساتھ ہمارے ماضی سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے اور اپنے لئے

رسول خدا کے اسلام کا کھوج لگائیں جس پر راشدین کی طرز حکومت بھی قائم تھی؛ اس کے لئے تو علم دین کے روایاتی ماخذوں اور ابتدائی تاریخ اسلام پر ہمیں بڑی جرات آمیز تحقیقات اور تنقیحات کرنی پڑیگی۔

ایسی تحقیق ضروری ہے خواہ وہ کسی مقصد کیلئے استعمال کی جائے۔ راشدی طرز حکومت کا پتہ چلانے کے بعد اس کو ایسی شکل دینا ہوگا جو وہ آج فطری ارتقاء کی صورت میں اختیار کرتی، اگر وہ ان حادثات سے دوچار نہ ہوئی ہوتی جن سے وہ مکمل زندگی اختیار کرنے سے پہلے دوچار ہوئی؛ ورنہ ہم ایک ایسی زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے جو عہد حاضر کے ڈھانچہ میں خوبی کے ساتھ بیٹھ نہ سکیگی۔ ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ اسلام کے اساسی رجحانات کی روشنی میں آج کی دنیا کے مسائل سے کامیابی کے ساتھ دوچار ہوں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس ملبے کو صاف نہ کیا جائے جو مانع علم ونظر ہے۔

لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ یہ وہ کام ہے جسے ساری دنیا کے ایسے اہل علم حضرات کو ملکر اور سر جوڑ کر کرنا ہوگا جن میں یہ ہمت ہو کہ قرآنی تادیلات اور حدیث اور فقہ کے ادب کی از سر نو تحقیق کریں اور اس سنت عرب یا خاص عادات و رسوم عرب سے جو فقہ میں کسی نہ کسی طرح داخل ہو گئی تھیں اُس سنت رسول کو جدا کریں جو سنت اللہ کی روشنی یا اس کی اتباع میں خود رسول اللہ نے واقعتاً عمل فرمایا تھا۔ ان خالص احادیث کو ان موضوع احادیث سے پاک کریں جو ابتدائی دو صدی ہجری میں حریف سیاسی جماعتوں

اور نزاعی فرقوں نے اپنی تکرار اور دعووں کی حمایت میں گھڑ لیا تھا اور بہ آسانی انہیں رسول کریم سے منسوب کر دیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ موقتی احکام کو دوامی اور عالمگیر احکام سے جدا کرنا ہوگا۔ یہی وہ صورت ہے جس سے ہم رسولِ خدا کے قائم کردہ امتہً وسطاً کی تنظیم و عمل کے حقیقی خط و خال معلوم کر سکتے ہیں۔

کام یہیں ختم نہیں ہوگا۔ اصلی تصویر کو پہلی حالت میں لے آنے اور عہد نبوی کے حقیقی اسلام کو دوبارہ دریافت کرنے کی ساعت ہی وہ صحیح ساعت ہوگی جبکہ جدید دنیا کی پیچیدہ ضروریات کے مطابق ہم اسلامی فکر و خیال کی تنظیم نو کر سکیں گے۔ کیونکہ جب تک پہلے یہ تصویر اصلی حالت پہ نہ آجائے تنظیم نو کی یہ کوشش ایسی ہی ایک پیوند کاری ہوگی جیسی کہ زمانہ بعید میں ہوئی یا حال میں اجتہاد کی ہر ایک کوشش رہی ہے۔ اس راہ میں جو چیز حائل ہے وہ زنگ ہے جو ادب حدیث کے سونے پر تا حال چڑھا ہوا ہے اور جس کا بیشتر حصہ اصل میں یہودی، ایرانی، نسطوری یا نوفلاطونی رہا ہے۔ جو ارادتاً پیغمبرؐ سے منسوب کیا گیا۔ اور جس سے ایسے عقائد و اعمال رونما ہوئے جو اصل روح قرآنی کے مغائر تھے۔ جبتک کہ اصلی کندن نکال نہ لیا جائیگا اور جبتک کہ قابل ترین افراد جنہیں کم از کم آزاد اسلامی ممالک کی حکومتوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اپنی متفقہ کوششوں سے ادب حدیث کا مستند مواد اور اسی قسم کی مستند تفسیر قرآنی مرتب نہ کر لیں۔

اس وقت تک اسلامی مذہبی تعلیمات کی تشکیل نو اور ملت کے لئے ایک عام اساسی مقصد کی تاسیس کی کوئی کوشش خاطر خواہ نتائج پیدا نہ کر سکے گی۔

اسلام کو قرون وسطیٰ کے شکنجے سے آزاد کرانے کی منزل طے ہونے تک اور اس کے بعد کسی واحد ثقافتی بنیاد پر ساری ملّی جماعت کی تنظیم ہونے تک ہر ملک کے مسلمانوں سے اگر ان میں آج کے دندغوں کو سہ لینے اور زندہ رہنے کی تمنا ہے تو کم سے کم توقع جو کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فکر و عمل میں احساس حق یا احساس انسانیت کو فروغ دیا جائے اور اس اساس پر آج کی دنیا کے جملہ ترقی پسند رجحانات کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اگر انہیں واقعی روح قرآنی سے فیض و ہدایت مقصود ہے تو انہیں ان رجحانات کو اپنی گرفت میں لاکر انہیں وہ قرآنی چاشنی دینی ہوگی جس کی فی الوقت کمی ہے۔ کیونکہ یہی وہ کمی ہے جس نے ان رجحانات کو جو بصورت دیگر ترقی پذیر ہیں۔ تباہی کے آلات بنا دیا ہے اور ہماری ہی زندگی کے دوران میں دو مہیب اور ہولناک جنگیں پیش کی ہیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ چاشنی وقت پر نہ دی گئی تو مستقبل قریب میں انسانیت کے جسم کو ایک اور مہلک گھاؤ لگے گا۔ آخر یہ رجحانات ان کا سر چشمہ کچھ ہی ہو یا دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اقوام انہیں کتنے ہی مختلف مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ حقیقی روح قرآن سے ہم آہنگ ہی ہیں اور اپنی تاریخی ترقی کی بعض منزلوں میں واقعتاً اسکی تعلیمات سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں

یہ مسلمانوں کے لئے غور و فکر کا وقت ہے۔ دنیا بنی نوع انسان کیلئے جمہوری نظام تعمیر کرنے کی طرف گامزن ہے ــــ یہ وہ غایت ہے جس کو قرآن کریم نہایت عزیز رکھتا ہے۔ دنیا نے باوجود ان تمام موانعات کے جو سدِ راہ ہیں کرۂ ارض کی نعمتوں کو اجتماعی رنگ دینا شروع کر دیا ہے۔ یہ قرآن عظیم کا دوسرا اصل مقصود ہے! سائنس کی دنیا فطرت کی تمام پوشیدہ قوتوں کو کامل شغف کے ساتھ کھول رہی ہے اور انہیں انسان کی خدمت پر لگا رہی ہے ــــ اسی کی پکار قرآن کے ہر گوشہ سے بلند ہو کر فضائے عالم میں گونج رہی ہے۔ اس لئے اسلامی ممالک کو جدید دنیا کے نمایاں رجحانات سے ہم دوش ہوتے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنے روحانی اساس سے کٹ کر یا قرآن مجید کے نشان دادہ عالمی مقصد سے بے نیاز ہو کر اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے پیچھے پڑیں تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو ساری دنیا کا ہونے والا ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے اندر اجتماعی طور پر احساس حق پیدا کریں جس کو قرآن زندگی کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور اس پر انتہائی زور دیتا ہے اور اسی طرح انفرادی طور پر بھی اسی احساس حق کو اپنے اندر قوی کریں یا بالفاظِ دیگر اگر وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائی پر اپنی کامل توجہ صرف کریں تو اب بھی انہیں امۃً وسطاً کا بلند مقام حاصل ہو سکتا ہے اور وہ آج کی دنیا کی افراط و تفریط کے درمیان میزانِ عدل قائم کر سکتے ہیں!

باب ہشتم

پس چہ باید کرد[1]

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے امکانات کیا ہیں؟ اس کی کیا صورت ہے کہ وہ زمانۂ حاضرہ کے رجحانات کو اچھی طرح سے سمجھ کر اُن کے ساتھ مطابقت پیدا کرلیں؟ دنیا میں مسلمان کوئی مختصر سی جماعت نہیں۔ یہ مختلف جغرافیائی قومیتوں اور ثقافتی طبقوں پر مشتمل، قریب پینتیس چالیس کروڑ نفوس ہوں گے۔ جس سرزمین پر یہ بستے ہیں وہ بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک ایک وسیع و عریض پیٹی کی طرح پھیلی ہوئی ہے جس کی لپیٹ میں افریقہ اور ایشیاء کے دونوں برِ اعظم آگئے ہیں۔ اسی میں سے کچھ شاخیں شمال اور جنوب کی طرف نکل گئی ہیں۔ یہ خط سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس وقت اینگلو امریکن اور روسی سیاست کی حریفانہ کشاکش کے درمیان بطور حد فاصل واقع

مسلمانوں کی جغرافیائی پوزیشن

ہے۔ اور ہر دو اطراف کے متقابل اثرات کی زد میں بھی ہے۔ اس کا

کچھ حصہ، بالخصوص وسط ایشیائی علاقہ، پہلے ہی سے روسی اقتدار کے ماتحت آچکا ہے لیکن دوسرے اسلامی ممالک (سوائے ترکی کے) ابھی تک غیر جانبدار ہیں۔ ایک طرف ان کی جغرافیائی پوزیشن کی اہمیت کا یہ عالم ہے لیکن دوسری طرف ان کی اقتصادی پستی کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جو مرفہ الحال کہا جاسکے۔ ان ممالک کے عوام افلاس اور جہالت کی تاریکیوں میں غرق کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر کہیں تجدد یا مغربیت کی جھلک نظر آتی ہے تو اول تو وہ صرف خاص خاص طبقوں تک محدود ہے اور پھر (بدقسمتی سے) انہیں بھی اس تہذیب کا نمائشی پہلو ہی پسند آیا۔ ان مایوس کن حالات میں اگر امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو یہ کہ اب دنیائے اسلام کے رگ وپے میں ایک سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے جس سے چند نئے انداز کے لیڈروں کی نمود ہوئی ہے۔ یہ لیڈر متنوع ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کو لئے ہوئے سامنے آئے ہیں۔ ان کے سر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان ممالک کے سیاسی شعور کے لئے صحیح راستے متعین کریں۔

ان ممالک کیلئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے قدرتی وسائل پیداوار کو ترقی دیں اور عوام کے اخلاق سنوارنے اور جہالت اور تنگ نظری کو دور کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کرلیا تو یہ ممالک امن عالم کے حصول اور قیام کیلئے ایک موثر قوت

بن جائیں گے اور اس طرح ان توقعات کو پورا کر سکیں گے جو مجلس اقوام متحدہ نے (جس کے ان میں سے بیشتر ممالک رکن ہیں) ان سے وابستہ کر رکھی ہیں لیکن اس مقصد کا حصول دوسرے ممالک سے فنی اور مالی امداد کے بغیر ناممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی مدد اس طرح حاصل ہو سکے گی کہ مدد دینے والے ممالک اس امداد کی ڈور سے اپنے سیاسی مفاد کا پتنگ نہ باندھ دیں۔ دوسرے یہ کہ اس امن کی نوعیت کیا ہوگی جس کی مجلس کیلئے مسلم اقوام کو مجلس کے دوسرے ارکان سے تعاون کرنا ہوگا۔

مجلس اقوام متحدہ کا وجود اس منشور کی رُو سے ظہور میں آیا تھا جسے اقوام متحدہ کی کانفرنس اور بین الاقوامی ادارہ نے ۱۹۴۵ء میں سانفرانسسکو کے مقام پر منظور کیا تھا۔ اس منشور کی رُو سے ان اقوام نے جنہوں نے اس مجلس کی رکنیت قبول کی ہے۔ یہ عہد و پیمان کیا ہے کہ وہ انسانی حقوق اور آزادی کے بنیادی اصولوں کے تحفظ اور نفاذ کے لئے بلاتفریق نسل، زبان اور مذہب، پوری پوری جدوجہد کریں گے۔ ۱۹۴۸ء میں مجلس کی جنرل اسمبلی نے تیس شقوں پر مشتمل "انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ" منظور کیا۔

عالمگیر حقوقِ انسانیت

تاکہ وہ تمام اقوام و ملل کی حسن کارکردگی کے ناپنے کا پیمانہ

بن سکے۔ یعنی اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی قوم نے مفاد عامہ کے لئے کچھ کیا ہے تو اس کے پرکھنے کا معیار یہ ہوگا کہ اس نے اپنے ہاں عالمگیر حقوق انسانیت کو کس حد تک نافذ کیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے اس اعلامیہ میں انسانیت کے بنیادی حقوق ——— شہری، سیاسی، اقتصادی، عمرانی، مذہبی اور ثقافتی حقوق بالتفصیل درج ہیں۔ وہ افراد اور اقوام کو اس کی دعوت دیتی ہے کہ وہ تعلیم و تدریس کے ذریعہ ان حقوق اور انسانی آزادی کی ذمہ داری کا احساس عام کریں اور قومی اور بین الاقوامی دونوں قسم کی اصلاحی تدابیر سے کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی اہمیت کو محسوس کرنے لگ جائیں، اور ان پر موثر طریق سے عمل پیرا ہوں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس اعلامیہ کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ "ان تمام حقوق کا مجموعہ ہے جو آج تک دنیا کی اقوام ممالک یا تہذیبوں نے انسان کو دیئے تھے"۔ اس اعلامیہ کا دوہرا مقصد ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ فرد میں ان صلاحیتوں کی نمود کر دے جن کی رو سے وہ اپنی طبعی اخلاقی، عقلی، ذہنی اور ملی زندگی میں صحیح آزادی کی زندگی بسر کر سکے۔ اور دوسرے یہ کہ ان افراد میں ایسی قابلیت پیدا کی جائے کہ وہ امن عالم کے قیام میں پورا پورا حصہ لے کر

مسلمان اور بنیادی حقوق کا اعلامیہ

جہاں تک قرآن کے مطالعہ کرنے والے کا تعلق ہے۔ مذکورہ منشور کی تمہید یا مقاصد کا کوئی لفظ یا بنیادی حقوق کے اعلامیہ کی کوئی شق بھی ایسی

نہیں جو اُس کیلئے غیر مانوس ہو۔ ایک ایسے مذہبی عقیدہ کے تحت جو انسان کے مقام کو خدا سے نیچے اور ساری کائنات سے اوپر قرار دیتا ہے اور نسل رنگ اور قبائلی امتیازات کو مٹا کر تمام نوع انسانی کو خدا کا کنبہ بن کر رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی ایسا کنبہ جس کا ہر فرد دوسرے افراد کیلئے راعی (چرواہے) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اِنسانی حقوق کا یہ عالمگیر اعلامیہ قرآن کے بنیادی پروگرام کا لازمی نتیجہ یا اسی کی بڑھی ہوئی شاخ کے مترادف ہے۔ بایں ہمہ۔ یہ حقیقت ہے کہ اقوام متحدہ کی طرف سے اِن حقوق کا اعلان نوعِ انسانی کو اس کے موجودہ مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں لے جاسکتا۔ اِسی باب میں قرآنی نقطہ نظر سے چند اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ وہ کونسا جذبہ ہے جو اقوام متحدہ کے منشور یا حقوقِ انسانی کے اعلامیہ کا محرک ہے۔ بالفاظ دیگر، کیا اس اسکیم کو تمام نوعِ اِنسانی کی فلاح و بہبود کے تصور کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے یا اُس سے کسی خاص ملک یا قوم کے مفاد کا تحفظ مقصود ہے؟

دوسرے یہ کہ عالمگیر حقوق کی فہرست کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسوقت دنیائے تہذیب کا کوئی ملک بھی ایسا ہے جسے اِس کا دعویٰ ہے کہ وہ ان حقوق پر اس طرح عمل پیرا ہے کہ اس کے ہاں کا معاشرہ دوسروں کے لئے مثال بن سکے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک کی

حکومت یا مجلس قانون سازہی ان حقوق کے نفاذ کیلئے قدم اٹھائیگی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان ممالک کا سیاسی نظام ایسا ہے کہ اس کی رُو سے زمام اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہے جن کی نگاہوں میں ان حقوق کا احترام ہو اور جن کے دلوں میں ان کی تنفیذ کی تڑپ؟

اور آخری سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں دستاویزات کے پیشِ نظر ایک ایسا نظام عالم ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک مشترک مقصد ہو اور وہ مقصد تمام دنیا کے ممالک کیلئے قابل قبول بھی ہو۔ آج دنیا کی جو حالت ہے اس کی رو سے دنیا دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ——— ایک طرف روس اور دوسری طرف امریکی کیمپ ——— ایک عالمگیر نظام (خواہ اس کی ہیئت کیسی ہی کیوں نہ ہو) اسی وقت ممکن ہوگا جب ان دونوں کیمپوں میں متضاد تصوراتِ زندگی میں مفاہمت کی صورت پیدا ہوسکے۔ یا کم ازکم یہ دونوں کیمپ باہمی تعاون کیلئے کوئی بین بین راہ نکال سکیں۔ کیا موجودہ صورت حال میں اس قسم کی مفاہمت کا امکان ہے؟

آئیے ذرا ان سوالات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

جذبۂ محرکہ کیا ہے؟

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عالمگیر حقوق انسانیت کے اعلامیہ کا محرک کونسا جذبہ یا مقصد ہے؟ یہ حقیقت کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ یہ خیال امریکہ سے اُبھرا تھا۔ یہی وہ ملک تھا جو گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سب سے زیادہ طاقتور ملک کی حیثیت

سے سامنے آیا۔ اتنا طاقتور کہ اس کی قوت بہت سی اقوام کی سیاسی پالیسی کو متاثر کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ مذکورۂ بالا اعلامیہ درحقیقت ایک بڑے پروگرام کا جزو ہے۔ جس کا مقصد امن عالم کا قیام ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس امن عالم کی نوعیت کیا ہے؟ جس کے حصول کیلئے یہ سارا پروگرام بنایا جا رہا ہے؟ یہ سوال، انسان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر اس لئے سامنے آتا ہے کہ دنیا کو اس سے پہلے اس قسم کے بلند آہنگ منصوبوں کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ یہ منصوبے اٹھائے تو گئے ان دعاوی کے ساتھ کہ ان سے مقصود نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن آخرالامر کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا میں استعماریت کے شکنجے اور مضبوط ہو گئے۔ لہٰذا موجودہ پروگرام کو دیکھ کر اس قسم کے سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ان سوالات کا جواب بھی امریکہ ہی کو دینا ہوگا۔ اس لئے کہ آج دنیا میں امن عالم کا کوئی فارمولا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک وہ امریکہ کی پالیسی کے موافق نہ ہو۔

اس بارہ میں حکومت امریکہ کے محکمۂ خارجہ کے ایک ذمہ دار رکن کا بیان پیش کیا جاتا ہے جو اس نے مذکورۂ صدر اعلامیہ کی منظوری کے فوری بعد دیا تھا۔ مسٹر جارج میک گھی، اسسٹنٹ سکرٹری امور خارجہ نے انجمن جمہوریہ نوجوانان (Young Democratic Club) کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:-

"اگر ہم امریکہ کی خارجی پالیسی کے بنیادی مقاصد، یعنی اپنے ملی قیام کے تحفظ اور اپنے معاشرہ کی بقاء کا حصول چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم آزاد اقوام کی امداد جاری رکھیں تاکہ وہ روسی اقتدار کو آگے بڑھنے سے روکتی رہیں۔ ہماری ہر وقت یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ روس اور امریکہ کی کشمکش محدود ترین حلقہ کے اندر رہے اور ان دونوں میں فوجی تصادم کی نوبت نہ آنے پائے لیکن یہ مقصد ہمارا قلیل ترین مقصد ہے۔ اتنی سی بات پر نہ تو اقوام عالم ہمارے مفاد کے لئے ایک محاذ پر جمع ہوں گی اور نہ ہی اُن پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے کوئی متحدہ کارروائی کریں گی جو آج آزاد دنیا کو درپیش ہیں ــــــ اس قسم کے مسائل، جیسے نئی نئی آزاد مملکتوں کا قیام تاکہ ان کے باشندے بہتر زندگی بسر کر سکیں یا بعض علاقوں میں اس قسم کا روز افزوں احساس کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں اس نہج سے حصّہ نہیں لے رہے جو ان کے ذرائع یا اُن کی عظیم روحانی خصوصیتوں کے شایانِ شان ہو ـــــــ ہمیں ان قوی محرکات کے چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم آزاد اقوام کو پوری پوری امداد دیں تاکہ وہ اپنی تمدنی، اقتصادی اور سیاسی مرفہ الحالی کو آگے بڑھا سکیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جمہوری اقوام خود اپنی تقدیر بھی

ترقی اور تحفظِ ذات کے جذبہ کے ماتحت ہمارے ساتھ رضاکارانہ
تعاون کیلئے تیار ہوسکیں گی اور صرف یہی طریقہ ہے جس سے ہم
اجتماعی امن وسلامتی اور بین الاقوامی ربط وتعاون کو حاصل کرسکیں گے
جس پر ہماری مستقبل کی خود مختار قومی زندگی کا انحصار ہے؟"

امریکی مفاد کا تحفظ

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس بیان میں کس طرح سارا زور امریکہ کی قومی حفاظت اور اس کی معاشرتی زندگی کی صیانت پر دیا گیا ہے؟ اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے — یعنی دنیا میں نئی نئی آزاد مملکتوں کی نمود، دوسری اقوام کی مالی امداد تاکہ وہ اپنی تمدنی اقتصادی اور سیاسی مرفہ الحالی کو بڑھا سکیں۔ وغیرہ وغیرہ —— یہ سب ذرائع ہیں، مذکورۂ بالا ہر دو مقاصد کے حصول کے لئے! اس بیان میں جو دوسری چیز نمایاں طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ امریکہ اس بات کو قطعاً روا نہیں رکھے گا جن اقوام کی وہ امداد کرے وہ غیر جانبدار رہیں۔ وہ ان سے توقع رکھے گا کہ وہ روس کی استعماریت کے خلاف رضاکارانہ طور پر آزاد امریکی محاذ میں شامل رہیں۔

یہ حقیقت کہ دوسری اقوام کو مدد دینے کے معاملہ میں امریکہ کی پالیسی آج بھی مذکورۂ بالا محرکات ومقتضیات ہی کی بنیادوں پر استوار ہے اس بیان سے بھی واضح ہے جو امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈین ایچیسن نے ۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو دیا تھا جبکہ ایوانِ نمائندگان میں پریذیڈنٹ ٹرومین کا

۹۰۰ ملین ڈالر والا امداد باہمی کا پروگرام زیر بحث تھا۔ مسٹر ایچی سن نے ہندوستان کے عوامی انتخابات کے نتائج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا :۔

> ہمارے وہ نمائندے جو ان انتخابات کے موقع پر خود ہندوستان میں موجود تھے بیک زبان کہتے ہیں کہ اگر نہرو حکومت نے آئندہ پانچ سال میں نمایاں اقتصادی ترقی کا ثبوت نہ دیا تو امکان یہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں جمہوری عناصر کو یا تو دائیں بازو کے انتہا پسندوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور یا کمیونسٹوں کا۔ میں پورے اعتماد اور بھروسہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر نہرو گورنمنٹ اپنے ملک کی اقتصادی ترقی کو نمایاں طور پر اہل ملک کے سامنے لے آئی تو وہ کمیونسٹوں کے خلاف جنگ جیت لے گی۔[۲]

تحفظ خویش، انسان کا جبلی تقاضہ ہے اس لئے امریکہ کی یہ خواہش کہ وہ اپنی قومی صیانت کا تحفظ کرلے۔ بین الاقوامی مفاد کو ناگوار نہیں گزرنا چاہیئے۔ میں تو یہاں تک بھی کہوں گا کہ اگر امریکہ اپنے اس جذبۂ تحفظ خویش کے ساتھ ساتھ دوسری اقوام کی مرفہ الحالی کا خیال رکھتا ہے، بالخصوص پسماندہ اقوام کا تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ نے تحفظ خویش کے جذبہ میں انسانیت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ امریکہ کے ارباب حل و عقد کی طرف سے اس قسم کے بیانات جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں، انسان کو یہ محسوس کرنے پر مجبور

کردیتے ہیں کہ دیگر اقوام عالم کی امداد کے یہ تمام اقدامات درحقیقت روس کے خلاف ایک متحدہ محاذ کے قیام کی کوششیں ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر سوچنا یہ ہوگا کہ کیا ان اقوام کے لئے جو امریکہ کی مختلف امدادی اسکیموں سے فائدہ حاصل کرتی ہیں۔ یا اس کے حصول کے لئے آرزومند ہیں۔ اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں رہے گا کہ وہ روسی اقتدار کی توسیع کے خلاف برد آزما رہیں اور اس مقصد کیلئے امریکہ کے ممد و معاون بنیں کہ وہ دنیا کو دو مسلّح محاذوں میں تقسیم کر رکھے؟ ایک محاذ وہ جس کا مقصد امریکہ کی قومی صیانت اور معیار زندگی کا تحفظ ہو اور دوسرا محاذ وہ جو روسی اقتدار کے زیر اثر رہے۔ امید کہ امریکہ کا فی الحقیقت یہ مقصود ہو۔

اسلام اور کمیونزم

اِس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو زیادہ غور طلب ہے۔ مختلف ممالک میں اپنے اپنے طور پر کمیونزم کی مخالفت مختلف وجوہات سے ہوسکتی ہے ——— خواہ یہ مخالفت امریکہ کے تعاون کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر۔ لیکن کیا یہ ضرور ہے کہ اس باب میں جن ممالک کو امریکہ کا تعاون حاصل ہو ان کے لئے یہ ناگزیر ہو کہ وہ امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظریۂ حیات سے بھی ہم آہنگی اختیار کریں؟ مثلاً اِسلامی ممالک کو لیجئے۔ ان پر ایک طرف سے کمیونزم کا دباؤ پڑ رہا ہے ——— اور دوسری طرف سے سرمایہ داری کا۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی نظام بھی اپنی موجودہ شکل میں قابلِ قبول نہ ہو۔ انکی نگاہوں

میں یہ دونوں نظریہ ہائے حیات باطل ہوں - لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ان میں سے ایک باطل کا استیصال اسی صورت میں ممکن ہو کہ یہ ممالک دوسرے باطل سے کامل طور پر ہم آہنگ ہو جائیں ؟ حال ہی میں اُس کانفرنس کی کارروائی شائع ہوئی ہے جو مارچ ۱۹۵۱ء میں واشنگٹن کے ادارہ مشرق وسطیٰ (Middle East Institute) کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں "زمانہ حاضر میں اسلام" کے عنوان پر متعدد خطبات و مقالات پڑھے گئے۔ یہ مقالات ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ جس کی "تمہید" کے حسب ذیل ٹکڑے سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں:

> باشندگان امریکہ کیلئے دنیائے اسلام کا مسئلہ بڑا اہم ہے - یہ اس لئے کہ (علاوہ اس کے کہ اسلامی ممالک کی جغرافیائی پوزیشن کتنی اہم ہے) یہ خطہ جو اپنے اندر بے پناہ اِمکانی قوتیں رکھتا ہے ابھی تک اس کشمکش میں غیر جانبدار ہے جو مغربی جمہوریتوں اور روسی کمیونزم اور اس کے زیر اثر ریاستوں کے درمیان جاری ہے۔ متعدد وجوہات کی بنا پر دنیائے اسلام کا میلان جمہوریتوں کی طرف ہے لیکن اس کے باوجود کچھ زبردست اثرات ایسے بھی ہیں جو نہ صرف ان ممالک کی جمہوریتوں کے ساتھ کامل توافق کی راہ میں حائل ہیں، بلکہ انہیں فریق مخالف کے محاذ کی طرف جھکا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا مکمل حل یہی نہیں کہ ہم ان ممالک کی

اقتصادی پستی کو دور کردیں۔ اس کا حل سوچنے میں ہمیں اس بنیادی تضاد کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو مغربی جمہوریتوں اور دنیائے اسلام کے نظریہ حیات میں ہے۔ مغرب اس باب میں اسی صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو یقین دلادے کہ جن اقدار کا وہ حامل ہے وہ ایک بہتر زندگی کی دلیل راہ ہیں۔

مغرب کے تقاضے اس سے ظاہر ہے کہ اس "تمہید" کا مصنف اس سے بالکل مطمئن نہ ہوگا کہ مسلم اقوام اپنے اقتصادی معیار کو بلند کرکے اشتراکیت کی دعوت کو مسترد کردیں۔ مغرب کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ممالک اس کے ساتھ پوری پوری ہم آہنگی اختیار کرلیں —— اپنی انفرادیت اور تشخص کو قائم رکھتے ہوئے نہیں بلکہ مغربی اقدار حیات کو بالکلیہ قبول کرتے ہوئے۔ اس قسم کی تدابیر کی محرک آرزوئیں کتنی ہی نیک کیوں نہ ہوں، یہ مسلمانوں کی نفسیات اور ان کی روایاتی خصوصیات کو یکسر نظر انداز کرتی رہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس سے کسی ملک کی غربت اور افلاس کا علاج ہوجاتا ہو تو وہ یقیناً کمیونزم کے خلاف محاذ قائم کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ اس حد تک تو مسلمان آسانی سے مغربی ممالک کا ساتھ دے سکتے ہیں لیکن اگر مغربی اقوام یہ سمجھتی ہوں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی اقدار حیات سے ہم آہنگ کرلیں گی (یعنی ان اقدار حیات

سے جو اسلامی تصور زندگی سے متضاد ہوں) تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بہت بڑے فریب میں مبتلا ہیں۔ یہ تو عمومی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک جمہوریت اور ان عالمگیر اقدارِ حیات کا تعلق ہے جن کا اظہار "انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ" میں کیا گیا ہے، مسلمان (ان مقاصد کے حصول کے لئے) بڑی جانفشانی سے مصروفِ جدوجہد ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ مقاصد اِس دَور میں خود اسلام کے بنیادی مقتضیات کے ضمن میں آجاتے ہیں۔ لیکن اُن کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ مغرب کے ان اقدارِ حیات کو اپنا لیں جو وہاں سے چل کر اس وقت تک مشرق میں پہنچ چکے ہیں۔ مشرق کا ان اقدارِ حیات سے تعارف، مغربی استعماریت اور ملوکیت کی گوناگوں شکلوں کی رو سے ہوا ہے۔ اور اس استعماریت و ملوکیت کا جسقدر تلخ تجربہ شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کو ہوا ہے دنیا کے کسی دوسرے ملک کو ایسا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔ پروفیسر حِطّی (Hitti) کے الفاظ ہیں:۔

> بدقسمتی سے گذشتہ دس بیس برس کے عرصے میں مغرب کا مشرق سے ہر رابطہ خوشگوار نہیں رہا۔ ہمارے مشنریوں، معلموں اور مبلغوں کے انسانیت ساز دعاوی اور فرنگی اور امریکی مدبروں اور فوجیوں کے اِنسانیت سوز طرزِ عمل میں زمین اور آسمان کا تفاوت کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ قول و فعل کا اِس قدر

کھلا ہوا تضاد؟ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے ساری اہمیت
اپنے قومی اور اقتصادی اقدار ہی کو دی ہے۔ ذرا سوچئے کہ ہماری
نام نہاد ترقی یافتہ اقوام نے گذشتہ دو مہیب جنگوں میں جن کی
تباہیوں کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی، جو وطیرہ اختیار کیا۔
جس بے دردی سے انہوں نے بربادی اور سفاکی کی۔ اُن تمام قوتوں
کو بے لگام چھوڑ دیا جو ان کی سائنس اور مشینوں کی پیدا کردہ ہیں
اور جن سے دُنیا کی عافیت ابھی تک خطرے میں ہے۔ پھر امریکہ
برطانیہ اور فرانس اور دیگر اقوام عالم نے جو طرزِ عمل فلسطین کے
مسئلہ میں اختیار کیا۔ ان تمام حرکات کے مجموعی اثر نے مشرقِ وسطیٰ
کے اُن مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں جو اقوام مغرب سے
ذہنی روابط قائم کرنا چاہتے تھے۔ مغرب کی ان ہی کرتوتوں کا
نتیجہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے رہنے والے اُن سے اس طرح اظہارِ
بیگانگی کر رہے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے اب ان لوگوں کا مغربی
انسان کے کیرکٹر، اور ذاتی اور سیاسی دونوں سطحوں پر اُس کے
اخلاق پر اعتماد نہیں رہا۔[۳۱]

لہٰذا اگر اہلِ مغرب چاہتے ہیں کہ ان ممالک کے مسلمان جمہوریت
اور امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک موثر قوت بن جائیں تو اُس کے لئے
صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ ان مقاصد کو ان کے اپنے اقدارِ حیات سے ہم آہنگ

کیا جائے۔ اِس لئے کہ مسلمانوں میں ہزار خرابیاں ہوں ——— وہ خرابیاں بھی جو ان کی قدامت پرستی کا نتیجہ ہیں یا جو ان میں مغرب کی اندھی تقلید سے پیدا ہو چکی ہیں ——— یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ قرآن سے تعلق اور حضور رسالتمآبؐ کی ذات سے وابستگی کے احساسات ان کے دِل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے اور کوئی نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات اِن کے ہاں نہ بار پاسکتا ہے اور نہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ جب تک وہ ان کے ان گہرے اور شدید جذبات کی رعایت نہ رکھے۔ اپنی تہذیب وثقافت کے ان سرچشموں کے ساتھ جذبۂ وفا شعاری ہی وہ بنیاد ہے جس پر اُن کی سیاسیات کی عمارت استوار ہوتی ہے اور کوئی قوم انہیں اپنا طرفدار نہیں بنا سکتی جب تک وہ اُن کے ہاں اس دروازے سے داخل نہ ہو۔

ترکی اور اِسلام

کہا جاسکتا ہے کہ ترک بھی تو مسلمان ہی ہیں۔ وہ اِس طرح یکسر مغرب پرست کیوں بن گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اِس مغرب زدگی کا باعث ان کا وہ ذہنی بحران تھا جو بیحد نامساعد حالات کے مجموعی اثرات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں الغائے خلافت کا فیصلہ کیا جو صدیوں سے مسلمانانِ عالم میں کسی نہ کسی رنگ میں رشتۂ وحدت کا موجب بنے چلے آ رہی تھی۔ اِسی سال انہوں نے وزارت امورِ مذہبی کو منسوخ اور شرعی عدالتوں کو

بند کر دیا۔ اُس کے بعد انہوں نے اپنے ضوابطِ قانون بدل ڈالے اور دینیات کے مدارس بند کر دیئے۔ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے رومی ٹوپی کو سر سے اتار پھینکا۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے اتاترک کا پہلا مجسمہ نصب کیا اور ۱۹۲۸ء میں اپنے دستورِ مملکت سے ان شقوں کو حذف کر دیا جن میں یہ لکھا تھا کہ ترکی کا مملکتی مذہب اسلام ہے۔ اس کے دوسرے سال مذہبی تعلیم کو بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات بند کیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں جبہ و عمامہ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۳۷ء میں اس کا اعلان کیا گیا کہ ترکی کا آئین غیر مذہبی (Secular) ہے۔ اس طرح انہوں نے سرکاری طور پر مذہب سے اپنا تعلق یکسر منقطع کر لیا۔

لیکن کیا اس سے اسلام بھی ترکی سے جلا وطن ہو گیا اور ترکوں نے اس کی ضرورت کو محسوس کرنا چھوڑ دیا؟ جن لوگوں نے ان تبدیلیوں کا سطحی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ ان ظواہر سے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ لیکن جن نگاہوں نے سطح سے نیچے اتر کر دیکھا ہے انہوں نے محسوس کیا ہے کہ ترکوں کے دل کی گہرائیوں میں مذہب کی محبت اسی طرح موج زن ہے۔ ترکی کے نئے حاکموں نے اپنے شوقِ تجدد میں چاہا کہ مذہب کو بھی جدید قالب میں ڈھال لیا جائے لیکن ان کا طریقِ کار بھونڈا تھا۔ جہاں تک مملکت کو جمہوری رنگ میں رنگنے

کا تعلق تھا، ترک عوام اپنے لیڈروں کے ساتھ آخری حد تک جا سکتے تھے (اور وہ درحقیقت آخری حد تک گئے بھی) یہ تحریک انہیں کبھی ناگوار نہیں گذر سکتی تھی کیونکہ یہ اسلامی روایات کے عین مطابق تھی لیکن جہانتک مذہب کا تعلق تھا وہ اپنے لیڈروں کا ساتھ برضا و رغبت اس حد تک کبھی نہیں دے سکتے تھے جس حد تک وہ (لیڈر) جانا چاہتے تھے اگر تجدید مذہب سے مقصود یہ ہوتا کہ اسلام کو ان زنجیروں سے آزاد کیا جائے جن میں ازمنۂ وسطیٰ (کے دورِ استبداد و تقلید) نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اور ان کی بجائے قرآنی اقدار کو نافذ کیا جائے، تو اجتہاد کی اس انقلابی مہم میں ترکی تمام عالمِ اسلامی کی قیادت کرتا۔ اس انقلاب عظیم کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلامی ممالک میں مغربی استعماریت اور مفاد پرستیوں کی روک تھام ہو جاتی اور دنیا قرآن کے اس اقتصادی نظام سے روشناس ہو جاتی، جس میں دولت کی فراوانیاں وہ انسانیت سوز چنگاریاں پیدا نہیں کر سکتیں جن سے کیمونزم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔

ترکی کیلئے یہ سب کچھ ممکن تھا جب اس نے ۱۹۲۴ء میں جمہوریت کا اعلان کیا ہے اس وقت دنیائے اسلام میں اس کی ابھی اتنی ساکھ باقی تھی لیکن اس کے ارباب بست و کشاد نے ایسا زرین موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ انہوں نے تجدید مذہب کے شوق میں جس کا بدقسمتی سے ان میں نہ کوئی ذہنی اعتبار سے اہل تھا نہ قلبی اعتبار سے مذہب کے ظواہر تو اپنا

تختۂ مشق بنایا۔ گویا ان کے نزدیک، مذہب نام تھا فقط ان شعائر و رسوم کا جن کے بدلنے سے (انہوں نے سمجھ لیا کہ) اسلام کی تجدید ہو جائیگی۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے نماز کی شکل بدل ڈالی۔ انہوں نے (تجدید مذہب کے لئے) جو کمیٹی ۱۹۳۰ء میں مقرر کی تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ اگر کچھ سوجھا تو اتنا کہ نماز، ترکی زبان میں پڑھی جائے اور اس کے لئے (زبانی پڑھنے کی بجائے) لکھے ہوئے کاغذ سامنے رکھ لئے جائیں۔ قدیم اور جدید دونوں قسم کی موسیقی، صوتی اور مزامیری، رائج کی جائے تبلیغی مشن۔ جدید طرز کے منبر۔ لباس کے کمرے اور صاف جوتوں سمیت مسجد میں آنے کی اجازت وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھیں اس کمیٹی کی سفارشات لیکن اس کمیٹی کو جلد ہی توڑ دینا پڑا۔ اس لئے کہ ترکوں کو منہاج نبوت کے ساتھ جو قلبی تعلق تھا اس کی وجہ سے وہ اس قسم کی بدعتوں کو کبھی پسند نہیں کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی اس جدید راستے پر گامزن ہو سکتے تھے۔ اس کمیٹی کی برطرفی درحقیقت پیش خیمہ تھی۔ (تجدد مذہب کے خلاف) اس ردعمل کا جو وہاں اب پورے طور پر نمودار ہو چکا ہے۔ اس بات میں مسٹر جون کنگسلے برج جو استنبول میں امریکی کشنر اطلاعات رہے ہیں لکھتے ہیں:۔

گذشتہ چند سالوں میں ترکوں کا رجحان بالکل سمتِ مخالف کی طرف ہو گیا ہے۔ حال ہی میں قدامت پرست رہناؤں کے

مطالبات کے پیش نظر کچھ مذہبی مراعات دی گئی ہیں سب سے پہلی رعایت محدود شکل میں مذہبی تعلیم کا اجرا ہے۔ شروع میں یہ خیال تھا کہ چوتھے اور پانچویں درجے میں مذہبی تعلیم کو اختیاری قرار دیا جائے اور اس میں صرف وہی طالب علم شریک ہوسکیں جو اپنے والدین سے اجازت نامہ لائیں۔ یہ تعلیم مدرسہ کے اوقات کے بعد دی جائے۔ ارباب حل و عقد کا منشاء یہ تھا کہ (اس طرح کا میں) ایسی احتیاط برتی جائے کہ مذہبی تعلیم پھر سے اس قدامت پرست طبقہ کے ہاتھ میں نہ جانے پائے جو جمہوریت کی اصلاحات کے بجائے قدیم شرعی قوانین کو از سر نو رائج کر دے۔ اس سال سے مذہبی تعلیم کو جبری قرار دیدیا گیا ہے اور جو والدین اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم سے الگ رکھنا چاہیں اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے لئے اجازت حاصل کریں۔

دوسری رعایت یہ دی گئی ہے کہ جامعہ انقرہ میں دینیات کا شعبہ کھول دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شعبہ جدید سائنٹفک انداز کا ہوگا۔ اس مقصد کیلئے ضروری ہوگا کہ طالب علموں کو مختلف مذاہب کا متقابل مطالعہ کرایا جائے اور (مذہبی کتابوں کے) متن اور اسناد پر تنقید کی اجازت دی جائے۔ اگر یہ کچھ اسی طرح ہوا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس شعبہ دینیات کو اُس قسم کی مشکلات

کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو معتدل عیسائیوں کے علمبرداروں کو
پچھلی صدی میں پیش آئی تھیں؟

اس کے بعد مسٹر کنگسلے لکھتا ہے:[۶]

گزشتہ سال تک اگرچہ کہ قانوناً ضروری تھا کہ اذان ترکی زبان میں دی جائے لیکن اس پر عمل درآمد کبھی نہ ہو سکا۔ اب اذان عربی زبان ہی میں دی جاتی ہے۔ مجھے ابھی تک کوئی ترک ایسا نہیں ملا جو قرآن کو ترکی زبان میں پڑھنا پسند کرتا ہو۔ قرآن ابھی تک عربی ہی میں پڑھا جاتا ہے۔ بغیر ترجمہ یا تفسیر کے قرآن کے عربی الفاظ دہرائے جاتے ہیں جن کا مطلب کوئی ترک نہیں سمجھتا لیکن اس کے باوجود قرآن کے یہ عربی الفاظ ان کے دلوں میں گرم جوشی پیدا کر دیتے ہیں[۷]

میں نے ترکی کی مثال یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے کہ جس ملک کے مدبرین نے پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں یکسر مغرب کے رنگ میں رنگے جانا چاہیئے، وہاں کے عوام بھی اس پر آمادہ نہ ہو سکے کہ وہ اپنی ثقافتی روایات کو نگاہوں سے اوجھل ہو جانے دیں۔ اس

اسلام کی صحیح تجدید

وقت صورت حالات یہ ہے کہ قریب قریب ہر اسلامی ملک کے ارباب فکر و نظر سوچ رہے ہیں کہ وہ مذہبی قدامت پرستی کو برضا و رغبت خیرباد کہدیں اور اپنی تمدنی

فکر کو قرآنی بنیادوں پر از سرِ نو تشکیل دیں تاکہ اِس سے دورِ حاضر کے پیچیدہ تقاضے پورے ہو سکیں۔ اگر انہوں نے اپنی اس کوشش میں اتنی جراءت سے کام لیا کہ وہ مروجہ مذہبی عقائد و تصورات کے متن اور تاریخی اسناد کو تنقیدی نگاہ سے پرکھ کر دیکھ لیں (کہ ان میں سے کونسا اسلام کے اصلی سرچشمہ کے مطابق ہے اور کونسا بعد کا وضع کردہ) جس طرح (مسٹر گنگسلے کے خیال کے مطابق) انقرہ کے شعبۂ دینیات کو کرنا ہوگا تو اس سے اسلام کو بیش بہا فائدہ پہنچے گا۔ اگر (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کا مشورہ دیا ہے) یہ کام مسلمانانِ عالم کی باہمی مشاورت سے اجتماعی انداز میں کیا گیا تو اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کیلئے ایک مشترکہ ضابطۂ فقہ مرتب ہو جائے اور اس مشترکہ فقہ کی طرف خود ترکی بھی پلٹ آئے۔ اگر کہیں ایک مرتبہ بھی ایسا ہو گیا کہ (ہمارے مذہبی ذخائر میں سے) سونا اور کھوٹ الگ الگ ہو جائیں (یعنی قرآن کا حقیقی اسلام، بعد کے وضع کردہ عجمی اسلام سے نِتھر کر الگ ہو جائے) اور اس طرح مسلمان کا رشتہ پھر سے اس کے اصل سرچشمۂ حیات سے جڑ گیا تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دنیا بلا توقف و تامل مغربی جمہوریت کی ہر وہ چیز قبول کر لے گی جو قرآن کے مطابق ہوگی اور اس کے بدلے میں مغرب کو وہ کچھ دے سکے گی جس سے وہ اس وقت تک محروم ہے اور جس سے اس کے جمہوری تصورات

اور اقتصادی بنیادوں میں ایک روحانی انقلاب برپا ہوگا۔ اگر امریکہ چاہتا ہے کہ کمیونزم اسلامی ممالک میں نہ پھیلنے تو وہ آئے اور مسلمانوں کے اقتصادی معیار کو بلند کرنے میں نہایت نیک نیتی سے ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن اس سے آگے ان کے معاملات میں قطعاً دخل نہ دے۔ اس لئے کہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کوشش کرنا کہ مسلمان مغربی اقدارِ حیات کو بھی اپنالیں نہ صرف دشوار گذار راستہ ہے بلکہ آخر الامر سخت نقصان کا موجب بھی۔ راہِ صواب صرف یہ ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کو ان ہمہ گیر اقدار کی طرف مائل کیا جائے جو "انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ" میں درج ہیں اور جنہیں قبول کرنے کا وہ پہلے ہی اقرار کر چکے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کا طریقہ یہ نہیں کہ اپنے حریف مقابل (روس) کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی اسکیمیں بناتے چلے جائیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کی جائے۔ کامیابی کی راہ تطہیر نفس کے سوا اور کوئی نہیں۔

عملاً کچھ نہیں ہوا چھ سال کا عرصہ ہوگیا۔ جب "اقوام متحدہ کے منشور" پر دستخط ہوئے تھے اور تین سال ہونے کو آئے جب اقوام عالم نے "انسانی حقوق کے اعلامیہ" کی تائید کی تھی لیکن اس تمام عرصے میں ان دستاویزات کی دفعات کو عملاً نافذ کرنے اور ابن آدم کو طبعی، اخلاقی اور ذہنی آزادی سے ہمکنار کرنے کے سلسلے میں

کوئی نمایاں قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس دوران میں ایک کمیشن ضرور متعین کیا گیا تھا کہ وہ "انسانی حقوق" کی ترویج و تنفیذ کے لئے اسباب و ذرائع پر غور کرے لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر کمیشن کی مساعی ابھی تک بارآور نہیں ہو سکیں۔ اس جمود کے لئے کہیں یہ کہدیا جاتا ہے کہ کوریا کی جنگ اور جنوب مشرقی علاقوں میں فوجی نقل و حرکت ان "حقوق" کے عام ہونے کی راہ میں حائل ہو گئیں اور کہیں اس کا ذمہ دار مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے مسائل کو قرار دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے بین الاقوامی کشاکش زیادہ تیز ہو گئی۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ مختلف ممالک نے اپنے اپنے ہاں جو حفاظتی تدابیر اختیار کر رکھیں ہیں ان کی وجہ سے انسانی آزادی کے عام ہونے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن اس کا اصل سبب ان بیان کردہ وجوہات سے کہیں گہرا ہے۔ اسے میسو کیاسان (M. Rene Cassin) کے الفاظ میں سنئے جو اقوام متحدہ کے "انسانی حقوق" کے اس کمیشن کے نائب صدر تھے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

> سب سے پہلی دشواری یہ ہے کہ اس "اعلامیہ" میں جو حقوق اور آزادیاں درج ہیں۔ انہیں قانونی حیثیت دی جائے تاکہ اُن کی تکمیل سب پر قانوناً واجب ہو جائے۔ دُوسری دشواری اس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کونسا ادارہ ہوگا جو اس بات کی

نگرانی کرے گا کہ کس ملک نے ان حقوق کی عملی تنفیذ میں کس قدر ترقی کی ہے۔ نیز جو ان شکایات کو سننے کا مجاز ہو گا کہ جو ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف اِس بارے میں کرے کہ اُس نے ان حقوق کی اِس طرح خِلاف ورزی کی ہے۔ تیسری دشواری یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی کمیٹی مقرر کی جائے جو ان حقوق کی خِلاف ورزی کے مقدمات کی اپیلیں سُن سکے تو اس امر کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ اپیل کا حق کس کس کو حاصل ہو گا یعنی کیا صِرف ان مملکتوں کو اپیل کا حق ہو گا جنہوں نے ان "حقوق" کو تسلیم کر لیا ہے یا افراد کو (ان کی حکومتوں کے خلاف) بھی حقِ مرافعہ حاصل ہو گا۔ نیز غیر حکومتی اِداروں کو بھی؟ اِس نقطہ کی اہمیت کا اندازہ بآسانی لگ سکتا ہے۔ اِس کمیٹی کے سامنے دو سوال ہونگے یعنی یا تو مروجہ پامال طریقے علیٰ حالہٖ رہنے دیئے جائیں جن کی رُو سے کسی فرد کو حق حاصل نہیں کہ اپنی حکومت کے خلاف کسی خارجی عدالت میں اپیل کر سکے) یا پھر عدالتی ضوابط میں اِس قسم کی انقلابی تبدیلیاں کی جائیں کہ جہاں کسی مملکت کی رعایا کا کوئی فرد سمجھے کہ اس کا کوئی حق تلف کیا گیا ہے۔ وہ اپنی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف کسی بین الاقوامی اِدارہ میں اپیل کر سکے۔[۳]

مجلس اقوام کے سامنے آج یہی اور اسی نہج کی دوسری مشکلات ہیں۔ ان کا حل کس حد تک ممکن ہے؟ صرف اس حد تک کہ مختلف آزاد، خود مختار مملکتیں نوعِ انسانی کے حقوق کی عالمگیر ترقی کی خاطر اپنی "خود مختاری" سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہوں تاکہ اس سے ایک محکم نظامِ عالم قائم ہو سکے یعنی قرآنی تصور کے مطابق یہ مملکتیں اپنی "ارضی" خود مختاری کو اس خدا کے حوالے کر دیں جسے فرمانروائی کا حقیقی حق حاصل ہے! اور خود ایک ایسی برادری کی طرح مل جل کر رہیں جس میں ہر فرد دوسرے کے حقوق کا نگہبان (راعی۔ چرواہا) ہو۔ ان مفاد پرستیوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو آجکل دنیا کی جمہوری حکومتوں کا مطمح نگاہ ہیں اور ان انسانوں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے جو ان مملکتوں میں انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آجاتے ہیں۔ یہ کہنا آسان نہیں کہ ان حکومتوں کی طرف سے اس سوال کا صحیح جواب بر وقت مل سکے گا۔ (اور وہ نوعِ انسانی کے مفادِ کلی کی خاطر اپنے اپنی فرمانروائی پر خود ہی پابندیاں عائد کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی)

صحیح راستہ

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں اس مشکل کا حل کیا ہے؟

کرنے کا کام

جب تک اینگلو امریکی بلاک کے سر پر یہ ہوا سوار ہے کہ کمیونزم دن بدن بڑھتا جا رہا ہے یا وہ بلاک اس پالیسی کو اپنے لئے مفید سمجھتا ہے کہ اشتراکی بھوت کے بھیانک تصور کو زندہ رکھنا چاہیئے اور وہ

اپنی تمام قوتوں کو اِس مقصد کیلئے وقف کئے ہوئے ہے کہ زیادہ سے زیادہ قوموں کو اپنا دوست بنایا جائے تاکہ روس کے خِلاف جنگ لڑی جائے۔ اِن دونوں محاذوں کا تصادم روز بروز شدید ہوتا جائے گا اور نوعِ انسانی ایکدوسرے کے خِلاف شمشیر بکف رہے گی۔ اگر اس بلاک کا مقصد یہ ہے کہ ایک عام اِنسان کو کِس طرح کمیونزم کے اثر سے دُور رکھا جائے تو اُس کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس (انسان) کے سامنے اس نسخے کا نعم البدل پیش کیا جائے جسے روس اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور جس میں اُسے اپنے افلاس اور مصائب کا عِلاج دِکھائی دیتا ہے۔ کمیونزم کا سیلاب صِرف اس طریقہ سے رک سکے گا۔ ایک عام اِنسان کی یہ خواہش تو ہوتی نہیں کہ اسے (رولز رائس (موٹر کار) مِلنی چاہیئے۔ اگر اسے اُس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی میسر ہوتی رہیں تو وہ اس کا خیال تک بھی نہیں کرے گا کہ دوسروں کو اِس قدر فراواں سامانِ زیست کیوں مِل رہا ہے۔ یہ بنیادی ضروریاتِ زندگی بہر کیف "خدا کی زمین" بہم پہنچا دیگی بشرطیکہ وہ حکومتیں جنہوں نے "حقوقِ انسانی کے اعلامیہ" پر دستخط کئے ہیں ایک دوسرے کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں اور نیک نیتی سے ان ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کا تہیہ کریں۔ اگر یہ نام نہاد "آزاد دنیا" زندگی کو اِسطرح نئے سانچوں میں ڈھال لے کہ اس میں ایک عام انسان کیلئے دلکشی پیدا ہو جائے تو اس عملی مثال کی قوت سے وہ نہ صرف آزاد دنیا میں کمیونزم کی توسیع کو روک دیگی بلکہ خود کمیونسٹ خطہ کے انسان کو ایک ایسی

زندگی کی طرف مائل کرلے گی جس سے وہ کمیونزم کے اندر محروم ہے۔

کمیونزم کا نظریہ درحقیقت بھوک کا مسئلہ ہے بھوک اور احتیاج کا مارا ہوا انسان ہر اس چیز کو گوارا کرلیتا ہے جو اسے ان بلاؤں سے فوری نجات دیدے۔ لیکن جونہی بھوک کی تسکین ہوئی اور طبعی ضروریات کا دباؤ کم ہوا، انسانی فطرت جس کی نشوونما کا انحصار صرف روٹی پر نہیں اپنی تسکین کیلئے کسی اور چیز کی طالب ہوجائے گی۔ یہ "اور چیز" لامحالہ روحانی قسم کی ہوگی۔ فطرتِ انسانی کو اس کی طلب ہوگی اور ضرور ہوگی۔ آزاد دنیا کے لئے وہ وقت ایسا ہوگا کہ وہ (ان انسانوں سے ٹوٹے ہوئے) قدیم تعلقات کے رشتوں کی تجدید کرے اور انہیں محکم بنیادوں پر استوار کرلے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس دوران میں وہ خود اپنی زندگی کو نئے قالب میں ڈھال لے اور اپنی مادی ضروریات اور زندگی کے بلند تقاضوں میں توازن قائم کرلے اور اس نئے قالب کو کمیونسٹ دنیا کے سامنے بطور مثال پیش کرے۔ تاکہ وہ بھی اس کی تقلید کرنے لگے۔ یہ ہے دنیا میں وحدت قائم کرنے کا صحیح طریقہ۔ حلقہ بندیوں سے دنیا میں کبھی وحدت قائم نہ ہوسکے گی۔

روٹی کے بعد

یہ یقینی امر ہے کہ روس ایک نہ ایک دن اپنی مادی آسائشوں کی حرارت سے تنگ آکر روح کے تقاضوں کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی اس رجعت الی اللہ کا انداز کیا ہوگا۔ اس کے متعلق حتمی طور پر صرف مستقبل ہی بتا سکے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا جارہا

ہے، روس کی صلابت میں نرمی آتی جا رہی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ روس کی مرکزی حکومت نے مشرقی علاقوں کے مسلمانوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ کمیونزم کے اقتصادی نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہب پر کاربند رہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روس کی سرکاری پالیسی کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو وہاں اب بھی ایسے مرد اور عورتیں موجود ہیں جن کے دل کی گہرائیوں میں خدا موجود ہے۔ اس کی مثال خود اسٹالین کی زندگی کے واقعہ سے پیش کی جا سکتی ہے جس کا ذکر چرچل نے اپنی توزک کی چوتھی جلد میں کیا ہے۔ اگست ۱۹۴۲ء

روس میں خدا

کا ذکر ہے کہ چرچل ماسکو میں اسٹالین سے اتحادی فوجی کارروائی کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ چرچل لکھتا ہے کہ اسٹالین اس اسکیم سے اس درجہ متاثر ہوا کہ وہ اس کی تفصیلات کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا اور جب اس کی جاذبیت انتہائی نقطہ پر پہنچی تو وہ بے اختیار پکار اٹھا "خدا اس اسکیم کو کامیاب کرے۔"

یہ واقعہ اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ عوام تو ایک طرف خدا کا تصور اسٹالین تک کے دل کی گہرائیوں سے بھی نہیں نکل سکا۔ لہٰذا یہ توقع رکھنا بڑی خوش فہمی نہیں ہوگی کہ موجودہ روس کا کمیونسٹ ایک نہ ایک دن زندگی کے ارفع واعلیٰ مقاصد کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی حالت کا از سرِ نو جائزہ لے گا اور اپنے اسلوب کے مطابق باقی دنیا کے ساتھ دوش بدوش چل پڑے گا بشرطیکہ وہ لوگ جو آج اپنے مفاد کی خاطر دنیا سے کمیونزم کو ملیامیٹ کرنے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔

کمیونزم کے اصولوں کی روشنی میں خود اپنے نظامِ زندگی کی ناہمواریوں کو دور کریں تاکہ روسی کمیونسٹ بھی آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کر سکیں اس قسم کی باہمی مفاہمت میں پیشقدمی کرنے کے لئے اسٹالین کی اس تجویز پر وسعتِ نظر کیساتھ غور کرنا چاہیئے جس میں اس نے کہا ہے کہ ہمیں دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے کہ خود بھی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ اس مفاہمت سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ہوگا کہ دنیا کو کچھ وقت کیلئے امن نصیب ہوجائیگا اور دونوں کو اس کا موقعہ مل جائے گا کہ وہ اپنی اپنی حالت کا جائزہ لیں اور اپنی اپنی اصلاح کر لیں۔ اسٹالین کی مذکورۂ صدر تجویز یوں سامنے آئی تھی کہ چند امریکی اخبار اور ریڈیو ایڈیٹروں نے اُس سے پُوچھا کہ وہ بنیاد کونسی ہے جس سے سرمایہ داری نظام اور کمیونزم دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں اسٹالین نے کہا کہ

> اس کا امکان ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں پُرامن طریقہ سے ساتھ ساتھ رہ سکیں بشرطیکہ دونوں گروہوں کے دل میں تعاون کی خواہش ہو۔ وہ دونوں عہد و پیمان کی پابندی پر آمادگی ظاہر کریں اور اس کے لئے تیار ہوں کہ تمام مملکتوں کو مساوی حیثیت دی جائے اور کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے[1]

اِس میں شبہ نہیں کہ اس تجویز سے بدیہی مقصود تو اتنا ہی تھا کہ دونوں گروہوں میں

---

[1] یہ کتاب اسوقت لکھی گئی تھی جب مسٹر اسٹالین زندہ تھا۔

جو تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس میں کچھ وقت کے لئے کمی واقع ہو جائے لیکن اس کا بھی تو امکان ہے کہ اس عارضی مفاہمت کو بلند مقاصد کا ذریعہ بنا لیا جائے اور دونوں گروہ اپنے اپنے سیاسی نظریات کی اس طرح تشکیل نو کریں کہ ان میں مستقل مفاہمت کی شکل پیدا ہو جائے۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کیمونزم درحقیقت اس سرمایہ داری نظام کے خلاف صدائے احتجاج ہے جسے مغرب کی صنعت گری نے پیدا کیا ہے۔ اگر سرمایہ داری نظام والے ممالک واقعی چاہتے ہیں کہ وہ سبب دور ہو جائے جس کی بنیاد پر کیمونزم نے یہ صدائے احتجاج بلند کی ہے تو ان کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ انہیں اپنے اقتصادی نظام میں اس انداز کی تبدیلی کرنی ہوگی کہ جس سے دونوں گروہوں کے عوام مطمئن ہو جائیں ورنہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ وہ طریق عمل جس سے کیمونزم آج زندگی کے خطوط کو متعین کر رہی ہے کیسا ہی متشدد اور وہ راستہ دورِ حاضر کے کیمونسٹ

اگر آج مفاہمت نہ ہوئی تو؟

کیلئے کتنا ہی دشوار گذار اور صعوبت انگیز کیوں نہ ہو، آنے والی نسلیں جن کے سامنے صرف کیمونزم کے ثمرات و برکات رہ رہے ہوں گے۔ اس طرز زندگی پر اسقدر محکم یقین رکھیں گی کہ کوئی چیز ان کے اس محکم ایمان کو متزلزل نہیں کر سکے گی اشتمالی کاشت کاری کا ذکر کرتے ہوئے، خود چرچل نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا سماں آرہا ہے جس میں لاکھوں مرد یا عورتیں یا تو صفحۂ ہستی سے مٹائے جارہے تھے یا معاشرہ میں ان کا کوئی مقام باقی نہیں رہا تھا۔ یہ سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اور میں اس کے تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کئے جارہا ہوں لیکن اس کے بعد وہ نسل آئیگی جو ان صعوبات اور مصائب سے بالکل ناآشنا ہوگی لیکن اس کے ہاں رزق کی فراوانی ہوگی اور وہ اسٹالین کو دعائیں دیگی۔ مجھے برک کا یہ قول یاد ہے کہ "اگر ظلم کے بغیر اصلاحات حاصل نہیں ہوسکتیں تو میں ایسی اصلاحات سے باز آیا" (یہ اخلاقی اصول بڑا خوش آئند ہے لیکن) آج جبکہ ہمارے چاروں طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اس قسم کے اخلاقی وعظ لاحاصل ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن آنے والی نسلوں کے نزدیک کمیونزم کا طرزِ زندگی بالکل فطری ہوگا اور وہ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کا تہیہ کئے بیٹھے ہوں گی، سرمایہ دار جمہوریتوں کیلئے ان کا مقابلہ کس طرح سے ممکن ہوگا؟ ابھی تو کمیونزم اپنے تجرباتی مراحل میں سے گذر رہی ہے۔ اس لئے اگر اسوقت کوئی ایسا خوشگوار بدل پیدا کرلیا جائے جو کمیونزم اور سرمایہ داری نظام کے درمیان مفاہمت کراسکے اور جو روئے زمین کے عام انسانوں کے لئے قابل قبول ہو، تو یہ نظریہ ان ہردو کی جگہ لے سکتا ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو دورِ حاضرہ کی جمہوریتوں کے

لیڈر اپنے آنے والے بچوں کیلئے مصائب و نوائب کا انبار چھوڑ جائیں گے جن پر قابو پانا اُن بیچاروں کے بس کی بات نہ ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ روسی کمیونزم میں قابل لحاظ ترمیم کا امکان ہے۔ اس تجربہ سے بھی ظاہر ہے جو چین میں کیا جارہا ہے۔ یعنی اس چین میں جو یقیناً روس کی طرف جھک چکا ہے۔ اِس باب میں مسٹر ایلن وننگٹن (Alan Winington) رقمطراز ہے۔

آزاد چین میں تمام بنیادی اور کلیدی صنعتیں سرکاری ہیں لیکن خانگی سرمایہ داروں کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور امداد و سرپرستی بھی تاکہ وہ ثانوی صنعتوں کو ترقی دیں اور روزمرہ کی کھپت کی چیزیں تیار کریں۔ وہاں مزدوروں کے اداروں اور کارخانوں کے مالکوں کے درمیان اُجرت کے شرائط طے کی جاتی ہیں اور اُن بنیادوں کا تعیّن کیا جاتا ہے جو مزدور اور سرمایہ دار دونوں کیلئے نفع بخش ہوں۔ چنانچہ آپ وہاں کسی مزدور کو دیکھئے خواہ وہ کسی سرکاری کارخانے میں ملازم ہو یا خانگی اِدارہ میں، وہ آپکو خوش و خرم نظر آئیگا۔ اور پوچھنے پر بتائیگا کہ اب اس کے حالات کیسے اچھے ہیں اور وہ صنعتی ترقی کے لیئے ذاتی طور پر کیا کچھ کر رہا ہے۔ مجھے وہاں کے کئی سرمایہ داروں نے بھی بتایا کہ وہ جس قدر اب خوش حال ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے اور وہ حسبِ اِستطاعت اپنا

سارے کا سارا سرمایہ صنعت میں لگا رہے ہیں۔[ملا]

جب روسی زندگی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہاں کے اقتصادی نظام میں اس قسم کی تبدیلی جائز ہے تو اس کا امکان کیوں نہیں کہ کمیونزم تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ اسی کیپٹل ازم کے دوش بدوش چل سکے گی جس میں اب خود اشتراکی رنگ کی آمیزش ہو رہی ہے۔ اب یہ اقوام متحدہ کا کام ہے کہ وہ ان دونوں مخالف گروہوں کے لیڈروں کو ایک جگہ جمع کرے تاکہ وہ باہمی تعاون کے ذریعہ پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے کی تجاویز سوچ نکالیں۔ جہاں تک روس کا تعلق ہے اس امر کے باور کرنے کی کئی وجوہات موجود ہیں کہ وہ موجودہ کشمکش سے نکلنے کی باوقار راہ تلاش کرنے کا خواہشمند ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے گذشتہ اپریل میں بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس جس میں انچاس قوموں کے نمائندے شریک ہوئے تھے بلائی تھی۔ اگر اسکا یہ جذبہ صادق ہے اور اس کیلئے ادھر سے بھی ہاتھ بڑھایا گیا تو یہی چیز دونوں گروہوں میں ایک ایسی امتزاجی کیفیت پیدا کرسکتی ہے جو آخرالامر دنیا کی وحدت کا موجب بن جائے۔

اس چیز کا فیصلہ تو مستقبل ہی کرسکتا ہے کہ یہ آرزو شرمندۂ عمل بھی ہوگی یا نہیں، لیکن اگر حالات کا رخ کبھی بھی اس سمت کو پھرا تو اس امتزاج کیلئے اسلامی ممالک کارِ نمایاں کرسکیں گے بشرطیکہ وہ قرآن کے ان اقتصادی نظریات کی طرف لوٹ آئیں جنہیں انہوں نے اس وقت نہایت بے دردی سے پس پشت ڈال رکھا

قرآن کیا کچھ کرسکتا ہے؟

ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں قرآن کے ان نظریات نے اس زمانے کی متخاصم اقتصادی قوتوں کے درمیان امتزاج پیدا کر دیا تھا۔ یہ متخاصم قوتیں وہی تھیں جو آج کیپٹل ازم اور کمیونزم کی شکل میں موجود ہیں۔ اگر ہمارے اسلامی ممالک نے اور کچھ نہ بھی کیا تو کم از کم وہ اتنا تو ضرور کر سکیں گے کہ ان دونوں مخالف گروہوں (روس اور جمہوری ممالک) میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بن جائیں، جیسا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گب (Gibb) کا خیال ہے جس نے اسلام کے مطالعہ میں ایک عمر صرف کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> اسلام آج بھی مغربی دنیا کے مبالغہ آمیز متضاد قوتوں میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ اسلام ہی مغربی نیشنل ازم کی انفرادیت اور روسی کمیونزم کی جکڑبندی دونوں کا مخالف ہے۔ اور ابھی تک اس اقتصادی ہوّے سے مغلوب نہیں ہوا جو آج یورپ اور روس دونوں کے اعصاب پر بری طرح سوار ہے۔ پروفیسر میاسنو (Massignon) نے اسلام کے عمرانی اخلاقیات کو ان جامع الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے "اسلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر فرد معاشرہ سے مساویانہ حیثیت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قومی محاصل کی تعمیر میں امکان بھر حصہ لے۔ یہ زر کے غیر محدود تبادلے، بنک کے سرمائے، حکومت کے قرضے اور بنیادی ضروریات کی اشیاء پر بالواسطہ ٹیکس کے خلاف ہے لیکن اس کے باوجود یہ والدین اور خاوند کے حقوق۔ ذاتی

ملکیت اور تجارتی سرمایہ داری کا حامی ہے۔ اس باب میں بھی اسلام، مغربی سرمایہ دار جمہوریت اور روس کی کمیونزم کے درمیان وسطی کی حیثیت رکھتا ہے۔[۱۱۹]

قرآن کا اقتصادی نظام اسلامی اخلاقیاتِ عمرانی کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ تمام نوعِ انسانی امتِ واحدہ ہے۔ یعنی رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق تمام انسان عیال اللہ ہیں، ایک گلہ جس میں ہر فرد دوسرے کا راعی یا نگہبان ہے۔[۱۲۰] اس تصور کے ماتحت ہر قسم کا استحصال ناجائز قرار پاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر نوعِ انسانی کی اقتصادی زندگی کی وہ عمارت استوار ہوتی ہے جو قرآن کی مقصود و مطلوب ہے۔

قرآنی نظام کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔[۱۲۱] اسلام کے نزدیک پیداوار اور تقسیم کا کوئی نقشہ جائز نہیں قرار پا سکتا جب تک وہ اس بنیادی تصور سے مطابقت نہ رکھے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تمام منفعت بخش اشیاء کو زمین سے حاصل کرے لیکن شرط یہ ہے کہ تمام پیداوار کو ایک جا جمع کر کے اس طرح تقسیم کیا جائے کہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ یعنی اس پیداوار سے صرف وہی لوگ استفادہ نہ کریں جنہوں نے اس کے حصول کیلئے محنت کی ہے۔ اس سے وہ بھی فائدہ حاصل کریں جو کسی نہ کسی وجہ سے محنت اور مشقت سے معذور ہو چکے ہوں۔ تقسیم پیداوار کی

یہ شرط اِسلام کے اُس تصور کے اندر مضمر ہے جس کی رُو سے تمام نوعِ اِنسانی کو ایک کنبہ قرار دیا گیا ہے۔

غریبوں کا مسئلہ یعنی ان لوگوں کا مسئلہ جو کبرسنی، بیماری یا کسی اور ایسے ہی سبب سے روزی کمانے کے قابل نہ رہیں، انسانی معاشرہ کا قدیم ترین مسئلہ ہے۔ اِسلام سے پہلے اس مسئلہ کا زیادہ سے زیادہ حل یہ سوچا گیا کہ ایسے لوگ امیروں کی خیرات پر گذارہ کریں لیکن اسلام اس قسم کے بیکس و بے بس انسانوں کو گداگری کے ٹکڑوں پر کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ ملت کی دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے۔ قرآن بار بار اعلان کرتا ہے کہ جو کچھ زمین سے حاصل کیا جاتا ہے وہ صرف انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں خدا کا ہاتھ بھی شامل ہوتا ہے۔ فطرت کی تمام قوتیں جنہیں انسان اپنے کام میں لاتا ہے خدا کے تعاون کی زندہ شہادتیں ہیں۔ اِس اعتبار سے خدا انسان کا شریکِ کار ہو جاتا ہے بلکہ شریکِ غالب۔ قرآن کہتا ہے "اے جماعتِ مومنین اگر تم نے خدا کی مدد کی تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں دنیا میں ثبات عطا کر دے گا"[۱۵]۔ جب خدا انسان کا رفیقِ کار ٹھہرا تو ظاہر ہے کہ ہر پیداوار میں خدا کا حصّہ بھی ہوگا۔ خدا اپنے حصّہ کو اُن لوگوں کے لئے وقف کر دیتا ہے جو اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہ ہوں —— یتامیٰ، بیوائیں، محتاج، مساکین، نادار مسافر اور وہ لوگ جو ہنگامی حوادث کی وجہ سے حصولِ رزق سے محروم ہو چکے ہوں یا وہ جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں اور ایسے مقروض جو ادائیگی قرض کی وسعت نہ رکھتے ہوں[۱۶]۔ قرآن ان سب کو خدا کی

کفالت میں دیتا ہے۔ اسلئے کہ یہ خدا کی ذمہ داری ہے کہ جس نے اسے پیدا کیا ہے اُسے رزق بھی پہنچائے[18]۔ اس لئے قرآن ان لوگوں کا، جو رزق پیدا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں، یہ فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ مملکت کی طرف منتقل کر دیں تاکہ انہیں محتاجوں اور محروموں کی ضروریات پورا کرنے کیلئے صرف کیا جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں جسے وہ خدا کی محبت کا ثبوت قرار دیتا ہے[19]۔ وہ زکوٰۃ کی ادائیگی پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اسکا ذکر صلوٰۃ جیسے مقدس فریضے کے ساتھ کرتا ہے۔ اسکی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ جب خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بعض قبائل نے زکوٰۃ کو مرکزی بیت المال میں بھیجنے سے انکار کر دیا تو خلیفہ نے اُن کے خلاف اعلان جہاد کر دیا تا آنکہ انہوں نے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا[20]۔

لہٰذا اسلام میں کمزوروں اور غریبوں کی سرپرستی مملکت کی ذمہ داری ہے۔ قرآن کا نظام یہ ہے کہ ہر فرد معاشرہ کو کم از کم بنیادی ضروریات زندگی لازماً بہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ کے الفاظ میں "ہر انسان کا پیدائشی حق ہے کہ اسکے پاس رہنے کو مکان، ستر ڈھانپنے کو کپڑا، کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی ہو"[21]۔ حضورؐ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مفہوم ہے کہ مملکت کا کوئی فرد بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کا اسطرح انتظام کر کے جو اپنی روزی آپ نہ پیدا کر سکتے ہوں۔ قرآن اسکی پوری آزادی دیتا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ

دولت پیدا کریں اور تمام جائز طریقوں سے اپنے معیارِ زندگی کو بلند کریں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ روپیہ جمع کرنے کی ممانعت کرتا ہے اور دولت کی آزادانہ گردش کا حکم دیتا ہے[۲۲]۔ ہر فرد معاشرہ پر یہ شرط عائد کرتا ہے کہ معاملات میں کسی دُوسرے کی کمزوری سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ بنابریں قرآن ناجائز نفع اندوزی کے تمام طریقوں کو حرام قرار دیتا ہے اور قماربازی اور سٹہ کو ممنوع ٹھہراتا ہے لیکن چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر انفرادی یا اجتماعی طریق سے تمام ایسے کاروبار کی اجازت دیتا ہے جو معاشرہ کے مفادِ عمومی کے خلاف نہ جائیں۔ اس کے علاوہ استحصالِ زر کے تقاضوں کی حوصلہ شکنی کے پیش نظر ہر شخص کو حصولِ دولت کے مواقع فراہم کرنے کا یقین دلاتے ہوئے دولت کو ایک جا اکٹھا ہونے سے روکتا ہے یہ مقصد اسلامی قانونِ وراثت کے ذریعہ پورا کیا گیا ہے جس کی رُو سے کسی متوفی شخص کی دولت کسی ایک یا خاص فردِ خاندان کے قبضہ میں نہیں جاسکتی۔ بلکہ وہ جملہ قریبی رشتہ داروں میں تقسیم ہوجاتی ہے جیسے بیوی شوہر۔ بیٹے بیٹیاں۔ ماں باپ اور اگر نہ ہوں تو ہم جد قریبی رشتہ دار[۲۳]۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ اپنی جائداد کو کسی نیک ارادہ کے تحت کسی شخص یا اشخاص یا کوئی ادارہ کے حق میں وقف و وصیت کرسکتا ہے[۲۴]۔

مزدوروں سے تعلقات
آجر اور مزدور کے تعلقات میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس سے مزدور کا وقار قائم رہے اور اس کے مفاد کا تحفظ ہوجائے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں مزدور دو قسم کے

ہوتے تھے ـــــ غلام اور آزاد ـــــ غلام وہ ہوتے تھے جنہیں اسیر کر لیا جاتا
تھا یا وہ جو اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی آزادی کو روپیہ کے عوض بیچ
دیتے یا رہن رکھ دیتے تھے۔ ان بیچاروں کی حالت بڑی خراب تھی۔ رسول اللہ
نے سب سے پہلے اپنی توجہ انہوں کی طرف مبذول فرمائی۔ اس قسم کی غلامی اس
زمانے میں ساری دنیا میں رائج تھی اور عربوں کی اقتصادی زندگی کا جزو لاینفک
بن چکی تھی۔ اس لئے اسے آنِ واحد میں مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ
صلعم نے ایسے طریقے اختیار فرمائے جن سے وہ غلام جو اسوقت موجود تھے انسانیت
کی سطح پر آجائیں اور آہستہ آہستہ غلامی کا وجود مٹ جائے۔

سب سے پہلے آپ نے غلام کو اپنے آقا کے خاندان کا ایک رکن بنا دیا
اور اُسے بہت سی رعایتیں دیں جن میں جائداد کا مالک بننے اور آزادی حاصل کرنے
کے حقوق بھی شامل ہیں۔ رسول اللہ کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں[۲۵]: "جو تمہارے غلام
ہو گئے ہیں وہ تمہارے بھائی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ جو بھی شخص اپنے بھائی پر حاکم
مقتدر ہو اُسے وہی غذا کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اسے وہی لباس پہنائے
جو خود پہنتا ہے۔ اس سے ایسا کام نہ لیا جائے جس کو وہ جسمانی حیثیت سے
انجام دینے کے قابل نہ ہو اور اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو اس کام میں تم خود اسکی مدد کرو"
صرف یہی نہیں بلکہ اسکو آزادی دلانے کے ممکنہ ذرائع مہیا کر دیئے گئے۔ ہر دولتمند
آدمی پر جس کے پاس غلام ہوں، یہ حکم عائد کر دیا گیا کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی مذہبی
فروگذاشت پر بطور کفارہ ایک غلام آزاد کرے اور جہاں ایسی فروگذاشتیں کئے

امکانات کم تھے وہاں یہ بتایا گیا کہ غلاموں کو آزاد کرنا بھی ایک روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ قرآن کریم پوچھتا ہے کہ "وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ" "اور تم کو کیا خبر ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟" اور خود جواب دیتا ہے کہ "فَكُّ رَقَبَةٍ" "یہ ایک غلام کو آزاد کرنا ہے"۔ رسول اللہ فرماتے ہیں "کسی غلام کو آزاد کرنے سے بڑھ کر کوئی اور بات رسول اللہ کو خوش نہیں کرتی۔" (بخاری کتاب العتاق)

غلامی پر رسول اللہ کی ان توجہات کا اجتماعی اثر اتنا عظیم ہوا کہ غلام بھی سماج کا ایک باعزت فرد بن گیا۔ اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں کہ غلاموں نے بھی اسلامی مملکتوں پر حکومت کی۔ رسول اللہ کے ایک مقبول صحابی حضرت بلال رض جن کو مسجد نبوی میں پانچ وقت بذریعہ اذاں آنحضرتؐ اور اہل ایمان کو 'صلوٰۃ' اور 'فلاح' کی دعوت دینے کا شرف حاصل تھا در اصل ایک آزاد شدہ حبشی غلام تھے۔

اسی طرح آزاد مزدوروں کا مسئلہ بھی رسول اللہ کے توجہات کا مرکز رہا۔ آپ کا ارشاد تھا کہ "مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کردو۔" آپ نے مزدور کو "حبیب اللہ" کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ روایت ہے کہ ایک مزدور رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے ہاتھ سیاہ اور داغدار ہوگئے تھے۔ اسکی وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک معدن میں کام کرتا ہے اور اپنے آجر کیلئے پتھر کھود نکالتا ہے۔ آپ نے مزدور کی طرف نظر کرم سے دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔" اس باب میں رسول اللہ نے جس بات پر

سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ آجر کو ہمیشہ چاہیئے کہ وہ مزدور کے ساتھ معاملات میں عدل اور احسان کو ملحوظ رکھے اور اس کی بے بسی سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے۔

دو ذمہ داریاں

اُن تمام تدابیر سے بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل یا دولت کے استعمال کے وقت اُن دو ذمہ داریوں کو پیشِ نظر رکھے جو قرآن نے اس پر عائد کی ہیں ایک حقوق اللہ اور دُوسرے حقوق العباد یعنی ایک تو وہ ذمہ داریاں جو اس پر اس کی اپنی ذات کی ہیں اور دُوسرے معاشرہ کی ذمہ داریاں۔ قرآن نے انسانی زندگی کا جو معیار قائم کیا ہے اُسکا مظاہرہ دولت کے اسراف اور عیش و عشرت کے سامان سے نہیں ہوتا۔ اسکا مظاہرہ اس شکل میں ہوتا ہے کہ فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی تقاضے بھی پُورے ہوتے ہیں "روحانی تقاضوں" سے مراد ہے انسان کی یہ خواہش کہ وہ معاشرہ کے تقاضوں کو پورا کرے یعنی اپنی متاعِ عیش ان لوگوں کی ضروریات کیلئے بطیب خاطر دیدے جو سامانِ زیست سے محروم رہ گئے ہوں۔ اسی کو "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک یہ تقویٰ کی زندگی ہے اور یہی زندگی خدا کی نگاہوں میں واجب التکریم ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی حکومتیں چاہتی ہیں کہ وہ مغرب کے اُن متضاد و متخاصم گروہوں میں توازن قائم رکھ سکیں جو نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت نے پیدا کر رکھیں ہے تو اُن کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ قرآن کے اقتصادی نظام

کو اختیار کریں اور اُسے یورپ کے متخاصم گروہوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ
اس متوسط نظریۂ حیات کو اختیار کر کے اپنی موجودہ کشمکش کو ختم کر سکیں اگر
انہوں نے ایسا کر دیا تو جیسا کہ پروفیسر گب (Gibb) نے کہا ہے۔ اُن کیلئے
یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ نسل اور روایات کے اُن تضادات کو مٹا کر جو دنیا
کی نگاہوں میں اُمڈ رہے ہیں، مشرق و مغرب کی موجودہ خلیج کو پاٹ سکیں اور اس طرح
انسانیت میں وحدت قائم کر سکیں۔ پروفیسر گب (Gibb) کے الفاظ یہ ہیں:

اسلام کے ذمے انسانیت کی خدمت

اسلام کے ذمے انسانیت کی ایک اور خدمت بھی ہے اسلام
مشرق سے، بہ نسبت یورپ کے، زیادہ قریب ہے اور بین الاقوامی مفاہمت
اور روابط کی شاندار روایات کا حامل ہے۔ انسان کی مختلف نسلوں میں
ایک ایسی وحدت پیدا کرنا جس میں مدارج اور مواقع اور سعی و عمل کی
مساوات ہو، ایک مشکل مسئلہ ہے لیکن اس باب میں جس قدر کامیابی
اسلام کو ہوئی ہے تاریخ اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ افریقہ
ہندوستان اور انڈونیشیا کی کثیر التعداد اسلامی آبادیاں، نیز چین کی
نسبتہً قلیل اور جاپان کی بہت ہی قلیل التعداد اسلامی آبادی اس
حقیقت کی زندہ دلیل ہیں کہ اسلام میں اب بھی وہ قوت موجود ہے،
جس سے وہ نسل اور روایات کے اس قدر متضاد عناصر میں موافقت
پیدا کر دے۔ اگر مشرق اور مغرب کی اقوام باہمی تعاون سے ایک ہوں۔

تو اس کے لئے عالم اسلام ہی واحد ذریعہ بن سکتا ہے۔ نہ صرف
واحد بلکہ ایک لائینفک ذریعہ۔ آج یورپ کے سامنے مشرق سے متعلق جو
لاینحل مسائل ہیں۔ ان کا حل صرف دنیائے اسلام کے پاس ہے۔ اگر
اسلام کی وساطت سے مشرق اور مغرب کہیں ایک ہوجائیں تو دنیا کے
امن کے امکانات بہت وسیع ہوجائیں۔ اگر یورپ نے اسلام کے تعاون
اور رابطہ سے بے اعتنائی برتی اور اس مسئلہ کو قوت کے زور پر حل کرتا
چاہا تو یہ طریق کار مشرق اور مغرب دونوں کی تباہی کا موجب بن جائیگا۔
گب (Gibb) نے یہ الفاظ قریب بیس سال پہلے لکھے تھے۔ لیکن
بین الاقوامی سیاست کی بساط پر ان کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی بیس سال
پہلے تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر دنیائے اسلام اور مغرب کی جمہوریتیں ایکدوسرے
سے قریب ہوجائیں تو ان سے دونوں کو بیحد فائدہ ہوگا۔ پروفیسر گب (Gibb)
تو یہاں تک کہتا ہے کہ ــــــ "جہاں اپنی ثقافتی اور اقتصادی زندگی مکمل
نشو و نما کے لئے اسلام کیلئے مغرب سے تعاون لائینفک ہے، وہاں مغرب کیلئے
بھی اپنی ثقافتی اور روحانی زندگی کی نشو ونما کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اسلامی
سوسائٹی کی مضمر قوتوں اور امکانات سے فیض یاب ہو" ــــــ اب سوال یہ ہے
کہ کیا مغربی جمہوریتیں اس قسم کے تعاون کیلئے راہ ہموار کریں گی ؟
اس وقت اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے۔ اس
خلفشار کی وجوہات ہر ملک میں مختلف ہیں ان میں سے کچھ آپکی اپنی پیدا کردہ ہیں لیکن کچھ اس رابطہ

کا بھی نتیجہ ہیں جو انہوں نے مغرب سے پیدا کیا ہے۔ کیا مغربی جمہوریتیں جس حد تک بھی وہ ذمہ دار ہیں اس خلفشار کو کم کرنے کی کوشش کریں گی تاکہ مغرب اور اسلامی ممالک کے باہمی ارتباط اور خیر سگالی کی بنیادوں پر نئے رشتے استوار ہوسکیں اس کے ساتھ ہی کیا یہ جمہوریتیں باہمی مفاد کی خاطر اسلامی ممالک کو وہ اقتصادی اور فنی امداد بہم پہنچائیں گی جس کی انہیں اس وقت شدید ضرورت ہے تاکہ یہ ممالک اپنے اقتصادی معیار کو بلند کر کے امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک موثر قوت بن جائیں؟

یہ بات بہت جلد پردہ سے باہر آجائیگی کہ اسلامی ممالک کے ان تقاضوں کا جواب مغربی جمہوریتوں کی طرف سے کیا ملتا ہے۔ اِن کی طرف سے کچھ بھی جواب ہو اور ان کے ردِ عمل کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، مسلمانوں کو ایک چیز اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے اور وہ یہ کہ انہیں اس روشنی کی راہنمائی میں جو اسلام انہیں ایسا عطا کرتا ہے، اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے بنانی ہوگی۔ اگر وہ اسلام سے راہنمائی طلب کریں گے تو اسلام انہیں اس راہنمائی سے کبھی مایوس نہ کریگا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی ممالک کی موجودہ کشاکش ان کیلئے درپردہ رحمت ہے۔ یہ کشاکش اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے خوابِ گراں سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ان کی یہ باعزم بیداری یقیناً انہیں شاہراہِ حیات پر بہت آگے لے جائیگی۔ انہیں دوسری قوموں سے کچھ مدد ملے یا نہ ملے اگر انہوں نے قرآن کے اقتصادی نظام کو پوری دیانتداری سے اختیار کر لیا تو اُن کے محدود ذرائع

کے باوجود ان کی معاشرتی زندگی میں ایسا استحکام پیدا ہو جائے گا جو ہر فرد و ملت کو انسانی معیارِ زیست عطا کر دے گا۔

زاویۂ نگاہ کی تبدیلی لیکن قرآن کے اقتصادی نظام کو از سر نو اختیار کرنے کیلئے ایک بنیادی شرط ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے اندر وہ ذہنی تبدیلی پیدا کرے جو قرآن کا مقصود ہے۔ وہ ذہنی تبدیلی جو حقوق اللہ اور حقوق العباد یعنی ذاتی ذمہ داریوں اور معاشرتی ذمہ داریوں کو یکساں اہمیت دے اور جو اس نظامِ زندگی کے قیام کے لئے کوشاں ہو جس میں ہر فرد دوسرے کا راعی یعنی محافظ و نگہبان بن جائے۔ یہ "ذہنیت شبانی" (یعنی وہ ذہنیت جس میں ہر فرد یہ سمجھے کہ میں انسانیت کے گلّہ کا چرواہا ہوں) مسلمانوں کیلئے بھی ضروری ہے اور باقی نوعِ انسانی کے لئے بھی۔ جیسا کہ تاریخِ اسلام سے ظاہر ہے اس ذہنیت کا فروغ جمہوری ماحول میں سب سے زیادہ ہوتا ہے لیکن قرآن کا نظریۂ جمہوریت صالحین کی جمہوریت کا نظریہ ہے یعنی اُن انسانوں کی جمہوریت جو زندگی میں پورا توازن اور قرار پیدا کرتے ہیں اور انسانی معاشرہ کو ہر قسم کے استحصال سے محفوظ رکھتے ہیں۔ کیا آج کی دنیا اس کے لئے تیار ہے کہ صفحۂ ارض پر اس قسم کی جمہوریتوں کا جال بچھ جائے جس میں ہر جمہوریت باقی جمہوریتوں کی نگہبانی کا فریضہ انجام دے؟ یہی قرآن کی دعوت ہے۔ اور یہی وہ نہج زندگی ہے جو اسکا مطلوب و مقصود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باقی ماندہ دنیا سر دست قرآن کی اس دعوت پر کان نہ دھرے اور اسے درخورِ اعتنا نہ

سمجھے۔ لیکن اگر مسلمانوں نے بھی اس سے اعراض برتا تو اس کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر مسلمانوں کی موجودہ نسل آمادہ کر لے کہ وہ اس قدامت پرستی کو چھوڑ کر جو از منۂ متوسطہ سے ان پر چھائی ہوئی ہے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صفات خداوندی کو منعکس کر لے اور جس جمہوری اندازِ زندگی کی طرف قرآن راہنمائی کرتا ہے اسے اختیار کر لے تو ان میں آج بھی ان صلاحیتوں کی نمود ہو سکتی ہے۔ جو انہیں حوادث زمانہ کے زلزلوں سے محفوظ رکھ سکیں اور جن کی قوت سے یہ امنِ عالم کے قیام کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکیں۔

حوالہ جات

دیباچہ

۱۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم

۲۔ سنن ابوداؤد، کتاب الطہارۃ باب الوضو۔

۳۔ القرآن سورۃ الانبیاء آیۃ (۱۰۵)

۴۔ القرآن سورۃ البقرآیۃ (۲۸)

۵۔ بخاری، کتاب الاحکام

۶۔ القرآن سورۃ الاعراف آیۃ (۱۷۱)

باب اول

۱۔ احیاء العلوم جلد چہارم صفحہ ۳۴ مطبوعہ دارالکتب العربیۃ الکبریٰ مصر ۱۳۳۴ھ

۲۔ القرآن سورۃ ق آیۃ (۱۵)

۳۔ القرآن سورۃ المجادلۃ آیۃ (۸)

۴۔ بخاری، کتاب الاحکام

۵۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم۔

۶۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، مطبوعہ اوسٹن فلاڈ صفحہ ۵۸

۷۔ القرآن سورۃ آل عمران آیۃ (۱۰۲)

۸۔ القرآن سورۃ آل عمران آیۃ (۵)

باب دوم

۱۔ رسالہ "جینوین اسلام" سنگاپور جلد اول، شمارہ ۲، ۱۹۳۶ء

۲۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم۔

۳۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم۔

۴۔ بخاری، کتاب الاحکام

باب سوم

۱۔ "ڈسکورس آن پازیٹیو ریلیجن" لندن صفحہ ۱۳۴ سنہ ۱۸۹۱ء

۲۔ ابن عبدالبر، فضل العلم
۳۔ مشکوٰۃ، کتاب العلم
۴۔ حصن حصین
۵۔ "دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام"، ص۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۴ء
۶۔ " " " " ص۸۶
۷۔ "لوائح جامی" مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن جلد ۱۴ ص۱۷ ۱۹۰۶ء

باب چہارم

۱۔ ہسٹاریشیو آف اے ایرس جرنی" از بالگریو جلد اول ص۳۶۷
۲۔ " " " " ص۳۶۶
۳۔ "دی مسیج آف محمد" ڈینٹ اینڈ سنس لندن ص۴۲ ۱۹۲۳ء
۴۔ " " " " "
۵۔ " " " ص۱۵۰"
۶۔ بخاری، کتاب التوحید
۷۔ حصن حصین
۸۔ مجموعہ نظم از میتھو آرنلڈ میکملین اینڈ کو لندن ص۱۴۲ ۱۸۹۵ء
۹۔ " " " " ص۱۴۴
۱۰۔ بائبل، سینٹ میتھو (۳۶/۳۹)
۱۱۔ آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ از کارلائل
۱۲۔ " " " " "

باب پنجم

۱۔ بخاری، باب کیف بدء الوحی
۲۔ بیہقی، کتاب الایمان، باب شعب الایمان وفیض القدیر جلد سوم ص۵۰۵
۳۔ حصن حصین
۴۔ " "
۵۔ " "
۶۔ دعاء قنوت
۷۔ حصن حصین

۸۔ حصن حصین
۹۔ " "
۱۰۔ " "
۱۱۔ " "
۱۲۔ " "
۱۳۔ القرآن سورۃ العنکبوت آیۃ (۶۴)

باب ششم

۱۔ القرآن سورۃ الرحمن آیۃ (۲۹)
۲۔ مسلم، کتاب الجنۃ وصفاتہ
۳۔ القرآن سورۃ الرعد آیۃ (۳۵)
۴۔ " " محمد آیۃ (۱۶)
۵۔ " " البقر " (۲۳)
۶۔ " " مریم " (۶۳)
۷۔ مسلم، کتاب الجنۃ وصفاتہ
۸۔ تفسیر کبیر، از امام فخر الدین رازیؒ جلد سوم صفحہ ۵۷ مطبوعہ استنبول ۱۳۰۸ھ
۹۔ مشکوٰۃ باب الحوض وصفاتہ
۱۰۔ "گاسپل آف زرتشترا" از ڈاکٹر مس گیرین، دی تھیاسوفیکل پبلشنگ ہاوس اڈیار صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۸ سنہ ۱۹۵۱ء
۱۱۔ مسلم، کتاب الجنۃ وصفاتہ
۱۲۔ القرآن سورۃ مریم آیۃ (۷۲)
۱۳۔ "الدین" از مولانا عبد القدیر صدیقی حیدرآباد۔
۱۴۔ بخاری، کتاب التوحید
۱۵۔ القرآن سورۃ الاعراف۔ آیۃ (۱۵۶)
۱۶۔ فتح البیان، فتح الباری، دُرِّ منثور، احاد الارواح بحوالہ حاشیہ ترجمہ قرآن از مولانا محمد علی صفحہ ۴۷۲
۱۷۔ "انتخابات مثنوی" مولانا رومؒ از نکلسن صفحہ ۱۰۸
۱۸۔ حصن حصین
۱۹۔ فتوح الغیب از حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ

باب ہفتم

۱۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۹۴۸ ۱۱ھ کے واقعات
۲۔ "ماوردی" "الاحکام السلطانیہ" باب ۱۳ صفحہ ۱۳۷ مطبوعہ قاہرہ

۳۔ بخاری، کتاب الدیۃ

۴۔ بخاری، کتاب الجہاد، کتاب المناقب، فضائل حضرت عثمان رضؓ

۵۔ "دی پریچنگ آف اسلام" از سر تھامس آرنلڈ ص۵

۶۔ " " " "

۷۔ " " " ص۴۹-۵۰

باب ہشتم

۱۔

۲۔ اخبار "اسٹیٹسمین" دہلی مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۵۲ء ص۱

۳۔ "کرنٹ ٹرنڈس ان اسلام" پروفیسر فلپ حتی کا خطبہ صدارت مجموعہ موسومہ "اسلام ان دی ماڈرن ورلڈ" شائع کردہ دی مڈل ایسٹ انسٹیٹیوٹ، واشنگٹن ص۸

۴۔ مضمون "اسلام ان ماڈرن ترکی" از جان کنگسلے برج جو "اسلام ان دی ماڈرن ورلڈ" کے ص۴۳-۴۴ پر درج ہے۔

۵۔ " " " " ص۴۴

۶۔ " " " " ص۴۵

۷۔ " " " " ص۴۷

۸۔ موسیو رین کاسن کا مضمون رسالہ "کوریر" جلد ۴ ع۱۲ ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء ص۲

۹۔ اخبار "ہندو" مدارس مورخہ ۲ر اپریل ۱۹۵۴ء ص۲

۱۰۔ "دی رینج آف فیتھ" از ونسٹن چرچل ص۵

۱۱۔ "لائف ان ریڈ چائنا" از الین وننگٹن مضمون شائع شدہ اخبار "سنڈے اسٹینڈرڈ" بمبئی نمبر ۶۷ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۴۹ء

۱۲۔ "ویدر اسلام" ص۳۷۹ از پروفیسر ایچ اے آر گب مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء

۱۳۔ بخاری، کتاب الاحکام

۱۴۔ القرآن سورۃ البقرآیۃ (۲۸۴)

۱۵۔ القرآن سورۃ محمد آیۃ (۸)

۱۶۔ القرآن سورۃ البراءۃ آیۃ (۶۰)

۱۷۔ القرآن سورۃ یوسف آیۃ (۱)

۱۸۔ القرآن سورۃ البقرآیۃ (۲۶۷) و سورۃ الحشر آیۃ (۷) سورۃ الانعام آیۃ (۱۴)

۱۹۔ القرآن سورۃ البقرآیۃ (۱۹۱) سورۃ البقرآیۃ (۱۷۲) سورۃ الدہر آیۃ (۸)

۲۰۔ بخاری، کتاب الزکوٰۃ۔ و تاریخ طبری ص ۱۸۴۸ واقعات سالہ

۲۱۔ "پان اسلام ازم اینڈ بالشوزم" از مشیر حسین قدوائی ص ۳۱۱

۲۲۔ القرآن سورۃ البقرآیۃ (۲۷۵)

۲۳۔ القرآن سورۃ الحشر آیۃ (۶۰)

۲۴۔ القرآن سورۃ النساء آیۃ (۱۱، ۱۲ اور ۱۷۶)

۲۵۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "تفسیر طبری" جلد ۴ سورۃ النساء آیۃ (۱۱، ۱۲) نیز بخاری، کتاب الوصیت اور ہدایہ جلد ۴ کتاب الوصایا۔

۲۶۔ القرآن سورۃ البلد آیۃ (۱۴، ۱۳)

۲۷۔ خطبہ حجۃ الوداع

۲۸۔ "پان اسلام ازم اینڈ بالشوزم" ص ۲۷۱

۲۹۔ "ابن ماجہ" باب الرجل یسقی

۳۰۔ اسلام کے معاشی نظام کی تفصیل کیلئے ڈاکٹر محمد یوسف الدین ریڈر شعبہ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ کی کتاب "اسلام کے معاشی نظریے" ملاحظہ ہو جو دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس کا انگریزی ایڈیشن "دی اکنامکس ڈاکٹرنز آف اسلام" زیر طبع ہے نیز عربی ترجمہ بھی۔

۳۱۔ "ویدا اسلام" از پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر۔ گب صفحہ ۲۹

۳۲۔ " " " " ص ۲۸

اشاریہ

الف

ب

پ

ت

ٹ

ج

چ

ح

د